رانگ نمبر

(ناول)

مشتاق انجم

رانگ نمبر

(ناول)

مشتاق انجم

گلستاں پبلی کیشنز
۶۷-مولانا شوکت علی اسٹریٹ، (کولوٹولہ اسٹریٹ) کلکتہ-۷۰۰۰۷۳ (انڈیا)
Ph : (033) 2235 2519
Mob : 98306 16464 / 98314 47090

www.UrduDost.com

UrduDost Library

©مشتاق انجم / نوشابہ پروین

WRONG NUMBER

Novel by

MUSHTAQUE ANJUM

1st. Edition : 2006 ★ Price : Rs. 100/-

کتاب : رانگ نمبر

مصنف : مشتاق انجم

طبع اوّل : ۲۰۰۶ء

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ۱۰۰روپے (۱۰/امریکی ڈالر/ ۵ پونڈ)

کمپوزنگ : ایکمی گرافکس، کلکتہ

مطبع : دی گلوزی آرٹ پریس، کلکتہ

تقسیم کار

گلستاں پبلی کیشنز، ۱۶-زکریا اسٹریٹ، کلکتہ-۷۳

عثمانیہ بک ڈپو، ۱۲۵-رابندرسرانی، کلکتہ-۷۳

رائٹرز ایسوسی ایشن ہوڑہ، ۱۰-ہیم گھوش لین، شیب پور، ہوڑہ-۲

Published by

Gulistan Publications

Kolkata (India)

سوانحی اشارے

نام : مشتاق احمد
قلمی نام : مشتاق انجم
والد : محمد معین الدین (قلمی نام: صابر جمیل)
والدہ : سائرہ خاتون (مرحومہ)
ولادت : ۳۱/اگست ۱۹۵۵ء
جائے پیدائش : ہوڑہ (مغربی بنگال)
آبائی وطن : ہوڑہ
تعلیم : ایم۔اے۔ (کلکتہ یونیورسٹی)
شرفِ تلمذ : حضرتِ قیصر شمیم
شغل : سرکاری ملازمت (رائٹرس بلڈنگ، کلکتہ)
تصنیفات : بے گھری (افسانے) ۱۹۹۴ء
تلاش (افسانے) ۲۰۰۰ء
اندھی کھڑکی (افسانے) دیوناگری خط میں ۲۰۰۴ء
رانگ نمبر (ناول) ۲۰۰۶ء
انعامات : "بے گھری" پر بہار اردو اکاڈمی کا انعام برائے ۱۹۹۴ء
"تلاش" پر بہار اور مغربی بنگال اردو اکاڈمیوں کے انعامات برائے ۲۰۰۰ء
اعزاز : رائٹر ایسوسی ایشن، ہوڑہ ایوارڈ برائے ۲۰۰۳ء
وابستگی : رائٹرس ایسوسی ایشن، ہوڑہ
موجودہ پتہ : 11/2، ہیم گھوش لین، شیب پور، ہوڑہ-102 711
فون : (033) 2642 7624
موبائل : 94335 91634

انتساب

مہربان و مشفق خسر محترم

حاجی مختار احمد صاحب

کے نام

'رانگ نمبر' میری نظر میں

مقصود الٰہی شیخ

شجیل سے فون پر اس کا فیصلہ پوچھا گیا تھا۔اس نے''رانگ نمبر'' کہہ کر چونگا رکھ دیا۔نمبر غلط تھا نہ جواب! اس کے منہ سے نکلے دو لفظوں میں ایک فیصلہ مستور تھا! شجیل کا فیصلہ غلط تھا یا صحیح اس کا فیصلہ پڑھنے والے کو خود ہی کرنا ہے۔

افسانوں کے دو مجموعے''بے گھری''اور''تلاش'' پیش کر کے ادبی دنیا میں شہرت پانے اور اپنا مقام بنانے کے بعد مشتاق انجم نے''رانگ نمبر'' کے عنوان سے ناول پیش کیا ہے۔دو گھروں کی کہانی(A Tale of Two Families) کھری محبت کی سادہ داستان! جس میں دھنک رنگ ہیں ،اپنا پن ہے،اتار چڑھاؤ ہے۔مگر اس ناول میں کوئی گتھی یا الجھاؤ نہیں ہے،دلچسپی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔جس طرح قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے' بالکل اسی طرح سطر سطر کر کے ناول بن گیا ہے۔ایک ندی ہے' بہتی چلی جا رہی ہے۔آپ ناول اور اس کے لکھنے والے کا نام پڑھ کر ہی ناول زیرِ مطالعہ لاتے ہیں۔ لیکن پہلے ہی لمحے میں بیانیہ میں گم ہو جاتے ہیں اور کردار آپ کی توجہ کا مرکز بنتے چلے جاتے ہیں۔یہی مصنف کا کمال ہے۔

مشتاق انجم کا''رانگ نمبر''ان کے افسانوں سے ذرا ہٹ کر ہے۔کہیں دانستہ زور یا چونکاہٹ پیدا نہیں کی گئی۔آسان اور سلیس عبارت تاثر پیدا کرتی ہے۔تحریر میں دیرپائی ہے،سریت ہے اور انگلی تھام کر آگے لے جانے والا تجسس بھی گندھا ہوا ہے۔ناول کے سارے ہی موڑ تصنع سے پاک اور مبرا ہیں۔

کرداروں کا تعارف بتدریج ہوا ہے۔ہر کردار جیتا جاگتا ہے۔ماحول مصنوعی پن سے صاف ہے بلکہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔زندگی جمود کا شکار نہیں۔اپنے مسائل کے حل کے لیے رواں ہے۔جتنا تقاضہ ہے اسی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ناول نگار نے موجودہ زمانے کے رواں رجحانات کا خیال رکھا ہے،آنکھ مچولی نہیں کھیلی ہے۔واقعات کے عروج و اختتام کے ساتھ جذبات کا ٹمپو اونچا نیچا ہوتا ہے مگر حالات کی دردانگیزی کے سبب من کی پیڑا انتہا کو پہنچتی بھی ہے تو نگل نہیں لیتی! جذباتیت یوں گرفت میں نہیں لیتی کہ آدمی بیٹھ کر رونے لگے! فضا ایسی طاری ہوتی ہے کہ قاری مجہول یا مفعول بن کر نہیں' پلاٹ کا حصہ بن کر سوچنے لگتا ہے۔حرکی کرداروں کی اثر پذیری کا یہی کمال ہے' چمتکار ہے۔

آج ایک عام آدمی روزمرہ زندگی کو اپنی ہمت کے مطابق قبول کرتا ہے،اپنے آس پاس کے لوگوں کے برتاؤ اور اس کے نتیجے میں سوتا جاگتا ہے ۔ایک امن پسند شہری تن بتقدیر کسی پر فتویٰ لگاتا ہے نہ بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ناول کا ماحول ہمیں احساس تو دلاتا ہے کہ ایک طبقے کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں /سہولتیں میسر نہیں،وہ بدلاؤ چاہتا ہے مگر جب تک آسمان پھٹ نہ پڑے وہ مجبور ہے۔

ہیروئن شانتی مضبوط عورت ہے تو ہیرو میں لچک اور افہامی قوت توازن قائم کرنے میں معاون ہے۔کہانی میں بشمول مذہب اگر کسی قسم کا

Conflict سامنے آتا بھی ہے تو مصنف نے جو سماں باندھا ہے اس میں تعطل پیدا نہیں ہوتا، وہ تفریق وتفرقے کا او پائے کرنے کے جتن سے غافل نہیں رہا ہے۔اس نے کوئی سیاسی بھاشن بھی نہیں دیا۔شانتی کے پتا مکھرجی بابو کی شخصیت اپنی جگہ کشش رکھتی ہے۔ان میں استحکام ہے۔لطافت ومروت کے اس پیکر میں جاذبیت ہے۔دوسری طرف تجمیل کی ماں ہے۔اس کا ایثار بیٹے کے لیے محبت، اس کا احساس، اجتماعیت، اس کے وجود کی گمبھیر تا بن بولے عکس ریز ہے۔تجمیل کا باس، اس کا ہم کار اور دوست سبھی گوشت پوست کے انسان ہیں، فرشتے نہیں مگر ان میں رذالیت یا وہ عیب نہیں جو ان کو حقیر بنائیں! گلی کے نکڑ پر سگریٹ پان بیچنے والا ۔ٹیکسی ڈرائیور اور ہڑتال والے غریب غربا۔سبھی اہم اور بستی کی رونق ہیں۔کرداروں کی پورنماشی اجالا کر رہی ہے۔

ناول نگار نے شروع میں ''ہم بھی کچھ عرض کریں گے'' کے تحت ناول نگاری کی عمومی ضرورت کے حوالے سے مغربی بنگال میں اردو ناول نگاری اور اس کے مسائل پر منعقدہ بزم کی روداد لکھی ہے۔اس میں انھوں نے ایک مقرر کی طرف سے اٹھائے گئے نکتے کو بیان کیا ہے''یہاں کے افسانوں اور ناولوں کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ دہلی/لکھنؤ یا علی گڑھ میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔کہیں سے مغربی بنگال کی باس نہیں آتی......'' میرے نزدیک جہاں تک ''رانگ نمبر'' کا تعلق ہے اس میں نہ صرف مغربی بنگال نظر آتا ہے بلکہ اس میں ہندستان ہے۔بے لاگ تو نہیں لیکن ایک زاویے سے پاکستان بھی ہے۔بنگلہ دیش موجود ہے۔بہار کی مسلم کمیونٹی، مقامی بنگالی، بنگلہ دیش سے لٹ پٹ کر آنے والے سبھی پوری طرح Integrated دکھائی دیتے ہیں۔یہ ایک بشری کہانی ہے۔کہیں ناول کا جغرافیہ تنگ نہیں ہوا۔کہیں خواہ مخواہ ادبیت نہیں بگھاری گئی۔ویسے ادب ہے، ڈراما ہے، سیاست اور لطیف لمحوں/ جذبوں کا امتزاج ہے۔

پلاٹ کی بنت ایسی ہے کہ مقامیت بھی ہے اور کھڑکی کھول کر باہر بھی جھانکا گیا ہے۔مغربی بنگال یوں روشن ہے کہ اس میں اردو کا علی گڑھ، لکھنؤ اور دہلی تک سانس لیتا بالکل اوپرا نہیں لگتا۔مکھرجی بابو جہاں بنگالی دانشوروں کے مداح ہیں تو انھیں غالب اور اقبال سے بھی محبت ہے۔تجمیل کو مغربی بنگال کے محبوب رہنما بدھان چندر رائے الگ، اسے گرو رابندر ناتھ ٹیگور کے نوبل پرائز کے بارے میں واجبی باتیں معلوم ہیں جب کہ شانتی کی تربیت مکھرجی بابو نے ایسے کی ہے کہ وہ تجمیل کے سامنے شیخ محمد اقبال کے انگلستان جانے وہاں سے جرمنی پھر علامہ کو سر کا خطاب ملنے کا ذکر پورے اعتماد اور روانی سے کرتی ہے تب تجمیل بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔برسبیل تذکرہ جب علامہ اقبال کو سر کا خطاب دینے کے فیصلے سے گورنر (پنجاب) نے مطلع کیا تو اقبال نے قبول کرنے میں تامل دکھایا اور کہا کہ جب تک ان کے استاد مولوی میر حسن صاحب کو کوئی اعزاز نہیں دیا جاتا وہ خطاب نہیں لیں گے۔اس پر گورنر نے کہا کہ ''ہم نے ان کا نام نہیں سنا۔ان کی کسی کتاب کا چرچا نہیں ہوا۔'' علامہ نے فرمایا ''ان کی کتاب آپ کے سامنے کھڑی ہے!'' یوں مولوی سید میر حسن صاحب کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔

ناول کے مکھرجی بابو نے جس طرح علامہ اقبال کا اپنی بیٹی شانتی کے ذریعہ تعارف کرایا ہے اس نے مغربی بنگال میں لکھے گئے اس ناول میں وہ رنگ بھر دیا ہے جو پورے برصغیر کی گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی کر رہا ہے۔مغربی بنگال کے ایک متوسط ہندو گھرانے میں علامہ شیخ محمد اقبال کا ذکر اس سلیقے مگر سادہ اور سلیس انداز میں کرنا پل صراط سے گزرنا تھا۔اس کی تصویر کشی تجمیل کے احساسات کے ذریعہ یوں کی گئی ہے''ایک بنگالی کنبے میں علامہ اقبال کے سلسلے کی اتنی ڈھیر ساری باتیں سن کر حیرت ہو رہی تھی۔شانتی اس وقت تنہا ہوتی تو میں اس کا منہ چوم لیتا۔''اتنی ڈھیر ساری باتیں پڑھ کر آسان تو یہ رہے گا کہ مصنف کا قلم چوم لیا جائے جس نے مہارت سے ایسی قدرتی فضا قائم کی ہے کہ قطعی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔

ناول کی ابتدا نہایت سادگی سے مگر نہایت دلچسپ انداز میں ہوتی ہے اور قاری بھول جاتا ہے کہ آج کی بھاگتی دوڑتی مصروف زندگی میں ناول یا طویل مختصر افسانے پڑھنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں، وہ ''رانگ نمبر'' پڑھتا چلا جاتا ہے۔یہ ناول چار دوستوں کے اطراف گھومتا ہے۔اس کے

ثانوی کردار ہیروئن کے پتاجی، ہیرو کی ماں جی، بھونسلے ٹراویل کا مالک، محلے کا پنواڑی ٹیکسی ڈرائیور، ہوائی سفر کے بعد دوسرے شہر میں ملنے والے ہم کار کی روداد سبھی سمتوں میں زندگی ہمک رہی ہے۔کوئی بھی بھرتی کا کردار نہیں۔زندہ بندوں کے حالات کی آئینہ سازی ہے مگر بنیادی طور پر محبت کی کہانی ہے۔شجیل اور شانتی کی کہانی!

ہیرو شجیل ایک ٹراویل ایجنسی کا واحد مسلم کارکن ہے۔باس بھونسلے جانتا ہے کہ اس فرقے کے لوگوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔اس کے ممبئی دفتر کا ایک فرد اپنے مذہب پر کاربند ہوتے ہوئے چھبیس سالہ شجیل کا مخلص دوست بن جاتا ہے۔دوسرے دوستوں میں سمر سے آغاز میں ہی ملاقات ہوتی ہے اور اس کے تکیہ کلام سے ایسی فضا بن جاتی ہے جو خوشگوار ہے اور سپر امپوز نہیں لگتی۔ستم زدہ مایا سب کچھ سہہ کر زندگی کرنے کی مثال قائم کرتی دکھائی دیتی ہے اور شانتی ہے جو بھگوان کو نہیں مانتی مگر انسان کا سمان کرتی ہے۔ان کرداروں اور آس پاس کے چلتے پھرتے لوگوں کا احساس دلاتے ہوئے ایک ایسی کہانی بُنی گئی ہے کہ اس کے اندر سے مقصدیت پیدا ہو کر اجالا کرتی ہے۔

ہیرو بہار میں فرقہ واریت وفسادات کے مارے خاندان سے ہے اور ہیروئن بنگلہ دیش میں خون کے دریا سے گزر کر آئی ہے۔دونوں کے خاندان مغربی بنگال کے ساکن ہیں جس کی بوباس ان میں رچ بس گئی ہے۔حزن وملال ناول کا پس منظر ہے۔پَر افق پر چھایا ہوا یا محیط نہیں۔اسی لیے روشن پہلو متاثر کرتے ہیں۔رجائیت غالب ہے۔واقعات کا بیانیہ خوب تر ہے۔بالفرض برائے توازن ہی سہی یہ کہنا لازم ہوگا کہ ناول "رانگ نمبر" کلاسیکیت یا ادب عالیہ کا معیار چھو رہا ہے تو یہ کہنا ہرگز مبالغہ آرائی سے پاک ہے کہ یہ ایک زندہ رہ جانے والا ناول ثابت ہوگا،عوام میں مقبول ہوگا اور مرورِ زمانہ فراموش نہ ہوگا۔

مقصود الٰہی شیخ

24, Park Hill Drive, Bradford, BD8, ODF (UK)

ہم بھی کچھ عرض کریں......

خدا کا شکر ہے کہ اپنا پہلا ناول ''رانگ نمبر'' آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔
سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ افسانہ لکھتے لکھتے یہ اچانک ناول کیوں؟ اس کا محرک کیا ہے؟ مقصد کیا ہے؟ کچھ اور بھی سوالات سر اٹھا سکتے ہیں۔ میں سرِ دست ان سوالوں میں الجھنا نہیں چاہتا۔ فی الحال کلکتے کی ایک ادبی تقریب یاد آرہی ہے۔ اس کی مختصر روداد پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

ایک چھوٹا سا ہال، سنجیدہ قسم کے محدود سامعین، مختصر سا اسٹیج۔ جہاں نقیبِ بزم کے ساتھ صدرِ مجلس اور تین مقررین تشریف فرما تھے۔ مذاکرے کا موضوع تھا ''مغربی بنگال میں اردو ناول نگاری اور اس کے مسائل۔''
نقیب بزم نے رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد اس بات کا اعتراف کیا کہ آج ہم لوگ ایک انتہائی سنجیدہ اور بامقصد موضوع پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے یہاں مجتمع ہوئے ہیں۔ آج اردو ناول عالمی منظر نامے میں جس رتبے کو پہنچ چکا ہے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ بے شک اس پر اردو کے قلم کار فخر کر سکتے ہیں۔ یہ بات سو فی صد سچ ہے کہ اردو ناول آج روایتی، ترقی پسندانہ، علامتی اور تجریدی راستوں سے گزرتا ہوا ایک نئی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ یہاں بیانیہ ایک نئے انداز میں سامنے آیا ہے جہاں تازگی ہے اور تہہ داری بھی۔ اور یہ یقیناً نئی اور پرانی نسل کے قلم کاروں کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ ہے۔ لیکن مغربی بنگال میں تخلیق پانے والے بیشتر ناولوں پر نظر پڑتی ہے تو بہت زیادہ خوشی نہیں ہوتی ہے بلکہ چند سوال ابھر کر سامنے آتے ہیں اور ان میں پہلا سوال تو یہی ہے کہ آخر یہاں کے ناول نگاروں کے مسائل کیا ہیں؟
پہلے مقرر نے فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی بنگال میں آزادی سے پہلے اور اس کے بعد اچھے اور معیاری ناول لکھے گئے ہیں اور ان میں سے بعض کی اشاعت بھی ہوئی ہے۔ کہیں رسائل و جرائد میں، کہیں کتابی شکل میں۔ ان ناولوں پر مبصرین نے تبصرے بھی کیے اور ناقدین نے رائے زنی بھی کی لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے ناول نگار بہت جلد تھک جاتے ہیں۔ عام طور پر ایک یا دو ناول تک جاتے جاتے ہانپنے لگتے ہیں۔ مزید برآں ان کے یہاں مضبوط اور جاندار کردار نظر نہیں آتے جس کے سبب ان کی تحریریں دائم نہیں ہو پاتیں۔
دوسرے مقرر نے کہا کہ یہاں کے افسانوں اور ناولوں کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ دہلی، لکھنؤ یا علی گڑھ میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں یا کلکتے میں۔ کہیں سے بھی مغربی بنگال کی بو باس نہیں ملتی۔ کیا یہاں کی تخلیقات میں بنگال کا پس منظر، یہاں کی مٹی کی خوشبو، یہاں کی فضا کی نمائندگی نہیں ہونی چاہیے؟ کیا یہاں کے ناولوں اور افسانوں کو اپنے ماحول سے دور رکھ کر تخلیقی ذمے داریوں کی پاسداری ممکن ہے؟

تیسرے مقرر نے ایک مزید دلچسپ نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مغربی بنگال میں رقم ہونے والے افسانے اور ناول مقبول تو ہوتے ہیں لیکن پڑوسی ریاست سے شائع ہونے والی تخلیقات کی طرح موضوعِ بحث نہیں بنتے ۔اس لیے ان کی مناسب پذیرائی نہیں ہوتی ۔وہ مقبولیت کی صحیح بلندیوں پر نہیں پہنچ پاتے ۔اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ان تحریروں کو مناسب پروجیکشن نہیں ملتا ۔ہم یہاں جو کچھ لکھتے ہیں اسے یہیں تک محدود کر دیتے ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بقولِ شاعر :

کھڑکیاں کھول کے باہر کی طرف بھی دیکھیں

صدرِ مجلس نے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم رفتہ رفتہ اس بات کو فراموش کرتے جا رہے ہیں کہ ہم کیوں لکھتے ہیں اور کس کے لیے لکھتے ہیں ۔ہم نے مقصدیت کو ’شجرِ ممنوعہ‘ قرار دے کر اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی ہے ۔غور کرنے کی بات ہے کہ ہم صفحات پر صفحات سیاہ کرتے جاتے ہیں اور اس بات کا مطلق احساس نہیں ہوتا کہ آخر ہم اپنے اس عمل سے قوم معاشرے اور اپنے ہم وطنوں کو کیا دینا چاہتے ہیں؟ ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں مطالعے کی کمی ہے ۔ہم دوسری زبان کے ناولوں کا مطالعہ کریں تو اس حقیقت کا احساس ہو کہ ہماری ذمے داری کیا ہے اور ہمیں کس طرح ادا کرنا چاہیے ۔ایک بات اور عرض کر دوں کہ ’’بھول بھلیوں‘‘ میں گم ہونے اور قاری کو گم کرنے کا دور ختم ہو چکا لیکن اب بھی بعض لوگ اسی لکیر کو پیٹ رہے ہیں ۔اس سے باز آنے کی ضرورت ہے ۔میں سمجھتا ہوں کہ آج کے مذاکرے میں جن باتوں کی طرف دیگر مقررین نے توجہ دلائی ہے ان نکات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے ۔المختصر یہ کہ ہم آج کی گفتگو کو نظر میں رکھ کر قدم آگے بڑھائیں تو ہمارے بیشتر مسائل حل ہوں گے اور ہمارے راستے خود بخود ہموار ہو جائیں گے!

مندرجہ بالا تقریب کی روداد میں نے پیش کر دی ۔ظاہر ہے کہ یہ گفتگو نئی نہیں ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں سنجیدگی سے بحث ہو ۔اس گفتگو کو یہاں مختصر کرتے ہوئے عرض گزار ہوں کہ معزز قارئین ’’رانگ نمبر‘‘ کو صحیح تناظر میں رکھ کر غور فرمائیں ۔شاید کوئی بات نظر آجائے ۔بقولِ داغ :

زیرِ دیوار ذرا جھانک کے تم دیکھ تو لو
ناتواں بھرتے ہیں دل تھام کر آہیں کیوں کر

مشتاق انجم

ایک

موبائل فون کی ہلکی موسیقی نے مجھے چونکا دیا۔
جیب سے نکال کر مانیٹر پر نظر ڈالی۔
''دھت تیرے کی ــــــ''
''کیا ہوا میرے بھائی ــــــ؟'' بازو میں بیٹھے سمر نے پوچھا۔
''پیغام ہے ــــــ'' میں نے منہ بنایا۔
''کس کا میرے بھائی ــــــ؟'' اس نے اسی انداز میں کہا۔
''چیف کا ــــــ'' میں نے مانیٹر پر دیکھتے ہوئے کہا۔
''لیکن آج تو سنیچر یعنی چھٹی کا دن ہے میرے بھائی۔''
''کوئی ضروری کام نکل آیا ہو گا ــــــ چلتا ہوں ــــــ''
''کل کی پکنک کا کیا ہو گا میرے بھائی ــــــ؟''
''واپس آ کر بتاؤں گا۔'' میں نے نہ جاننے کے انداز میں کہا۔
''شانتی اور مایا سے کیا کہوں۔ وہ آتی ہی ہوں گی میرے بھائی۔''
''یار ــــــ تو اپنا تکیہ کلام بدل لے۔ ورنہ شادی کے بعد مایا کو بھی میرے بھائی کہہ کر پکارے گا۔''
''وہ تو اب بھی کرتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے تیرے جانے کے بعد ان لوگوں کو کیسے سمجھاؤں گا ــــــ میرے بھائی۔''
سمر، مایا اور شانتی میرے کالج کے ساتھی رہے ہیں۔ فرصت کے اوقات زیادہ تر انھیں کے ساتھ گزارتا ہوں۔ سمر اور مایا ایک سرکاری دفتر میں لگ گئے ہیں۔ شانتی کسی دفتر میں کام کرنے کی بجائے گھر میں رہ کر اپنے والد کی مدد کرنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ مکھر جی بابو پارک اسٹریٹ میں ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک دکان چلاتے ہیں۔
''کیا ہوا ــــــ تو کچھ بولتا کیوں نہیں۔ میں ان لوگوں سے کیا کہوں گا؟'' سمر نے اونچی آواز میں کہا۔
''کچھ بھی کہہ دینا۔ ڈیوٹی اِز ڈیوٹی۔''
''اور بیوٹی اِز بیوٹی بھی تو صحیح ہے میرے بھائی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''نوکری کا سوال ہے یار۔تو سمجھتا کیوں نہیں۔''

''سمجھتا ہوں ـــــ لیکن ان دونوں کو کیسے سمجھاؤں گا؟ پچھلے مہینے سے پکنک کا پروگرام ٹلتا آرہا ہے۔دسمبر ختم ہوا اور اب جنوری کا مہینہ بھی ختم ہونے کو ہے۔پکنک کا صحیح لطف تو سردیوں میں ہی آتا ہے میرے بھائی ـــــ''

''مجبوری ہے یار۔ملازمت سے لگے ہوئے ابھی ایک سال بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ـــــ؟'' کہتا ہوا میں اس کے کمرے سے باہر آگیا۔

دل میرا ابھی نہیں چاہ رہا تھا لیکن کیا کرتا۔چیف کے حکم کی خلاف ورزی میرے بس کی بات نہیں۔مشکل سے یہ ملازمت ہاتھ لگی ہے۔ابھی ایک سال کا عرصہ بھی پورا نہیں ہوا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ میں نے اس قلیل مدت میں اپنے آپ کو اس ٹریول ایجنسی کا ایک اہم حصہ بنالیا ہے۔چیف کو دوسروں سے زیادہ مجھ پر اعتماد رہتا ہے اور ہوگا کیوں نہیں؟ اس اعتماد کو حاصل کرنے کے لیے میں نے اپنا خون پسینہ ایک کردیا ہے۔

ہماری فرم کا نام بھونسلے ٹور اینڈ ٹریول ایجنسی ہے۔آر۔کے۔بھونسلے اس کے چیف ہیں۔اٹھارہ آدمیوں پر مشتمل اس فرم میں میرے علاوہ سبھی غیر مسلم ہیں۔بنگالی،بہاری،گجراتی،پنجابی اور مدراسی کے علاوہ ایک اُڑیا بھی ہمارے اسٹاف میں شامل ہے۔دو خوبصورت لڑکیاں ہیں جن میں سے تسنیم ریسپشن سنبھالتی ہے اور جینٹی کمپیوٹر۔چیف کا سلوک سب کے ساتھ مخلصانہ ہے۔یہاں ملازمین کی کوئی یونین نہیں ہے لیکن اسٹاف کو ہر طرح کی مراعات حاصل ہیں۔ہڑتال،لاک آؤٹ،میٹنگ اور جلوسوں کے اس شہر میں ایک ایسے دفتر کی موجودگی جس قدر حیرت انگیز ہے اتنی ہی دلچسپ بھی۔

ڈلہوزی میں لال دیگھی کے مشرقی کنارے پر واقع اس ٹریول ایجنسی کی بنیاد موجودہ چیف کے والد کے۔کے۔بھونسلے نے ڈالی تھی۔پرانے ملازمین ان کی خوب تعریفیں کرتے ہیں۔دو سال پہلے ایک حادثہ میں وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔تب سے ساری ذمہ داری مسٹر آر۔کے۔بھونسلے پر آگئی۔نوجوان بھونسلے نے باپ کے قائم کیے ہوئے اصولوں پر چلتے ہوئے جلد ہی تمام ملازمین کے دل جیت لیے۔یہی سبب ہے کہ ہم میں سے کوئی چیف کی حکم عدولی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب انٹرویو کے لیے پہلی بار اس دفتر میں آیا تھا ـــــ

چیف نے پہلے میرے کاغذات کا معاینہ کیا۔پھر اپنے مختلف سوالوں کے ذریعہ میرے اصولوں اور میرے خیالات کو کھنگالا اور تب چہرے پر رعب دار مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا تھا ـــــ

''مجھے امید ہے کہ آپ ایک بات ضرور یاد رکھیں گے کہ کوئی بھی کام اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب آپ کو ذہنی سکون اور آپ کے سینئر کو خوشی حاصل ہوجائے۔''

مجھے دفتر کے لیے تیار ہوتے دیکھ کر ماں بول پڑی۔

''آج تو کہاں جارہا ہے ـــــ؟''

''دفتر ـــــ'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''دفتر؟ ـــــ لیکن ـــــ''

اس سے قبل کہ ماں کچھ اور کہتی میں نے جلدی سے کہا۔

''ایک ضروری کام ہے ـــــ''

''مگر آج تیری چھٹی کا دن ہے۔''اس کی حیرت بدستور قائم تھی۔

''ہاں ماں۔لیکن دفتر میں مجھے طلب کیا گیا ہے تو یقیناً کوئی ضروری کام آپڑا ہوگا ـــــ''میں نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا۔

''آج صبح تو نے اچھی طرح ناشتہ نہیں کیا۔یہ سوچ کر کہ دوپہر کے وقت آرام سے گھر پر کھانا کھائے گا اور اب دفتر ـــــ''ماں نے اداس ہو کر کہا۔

''چھٹی مل گئی تو دوپہر کو کھانے کے وقت گھر آجاؤں گا۔اداس کیوں ہوتی ہو ـــــ''میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''چائے بنا دوں؟''

''نہیں، دیر ہو رہی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔میں دوپہر کو تیرا انتظار کروں گی۔''

''میری اچھی ماں ـــــ''میں نے لگاوٹ سے کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے ـــــ اب جا۔''وہ مسکرائی۔''راستے میں کسی طرح کی جلد بازی نہ کرنا۔کلکتے میں گاڑیاں بہت تیز رفتار سے چلتی ہیں۔''

''ماں ـــــ میں چھبیس سال کا ہوں ـــــ چھ کا نہیں۔''بریف کیس اٹھاتے ہوئے میں نے کہا۔

''ہاں؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔''اس نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

''ماں ـــــ تم بھی ـــــ''

''چھبیس کا ہے تو میرے لیے بہو کیوں نہیں لاتا؟''

''ارے باپ۔''میں کمرے سے باہر کی طرف بھاگا۔

''سنبھل کے ـــــ''ماں کی آواز آئی۔

میں نے پلٹ کے اسے خدا حافظ کہا اور آگے بڑھ گیا!

دو

جلدی جلدی چھوٹی بڑی گلیوں سے گزرتا ہوا میں سڑک پر نکل آیا۔
سارا علاقہ گنجان آبادی پر مشتمل ہے۔ جی ٹی روڈ کے مغربی حصے میں بنگالیوں کی اکثریت ہے۔ مشرقی حصے میں غیر بنگالیوں کی جن میں ہندو مسلمان سبھی شامل ہیں۔ عام طور پر لوگ امن پسند ہیں۔ بنگالی، بہاری اپنی اپنی شناخت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔
میں نے کلائی گھڑی دیکھی۔ دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ سنیچر کا دن ہونے کے سبب سڑک قدرے سنسان تھی۔ روزانہ کی طرح لوگ تھے نہ گاڑیاں۔ میرے گھر سے ڈلہوزی کا فاصلہ پانچ کیلومیٹر کا ہے ــــ اگر ٹیکسی مل جاتی تو میں پندرہ منٹ میں دفتر کے دروازے پر ہوتا۔ سوچ رہا تھا کہ چیف کی دوسری کال آنے سے قبل دفتر پہنچ جاتا تو بہتر ہوتا۔
''آج کچھ لوگے نہیں بابو ــــ؟'' نکڑ کے سگریٹ کی دکان سے آواز آئی۔
میں نے گردن گھما کر دیکھا۔
پھوٹک نے اپنی دکان سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر مسکرایا۔
دفتر جاتے وقت روزانہ اس کی دکان سے سگریٹ لینا میرا معمول ہے۔ وہ مجھے پہچانتا ہے اور میرے برانڈ کو بھی۔
میں مسکرا کر اس کی طرف بڑھ گیا۔
''ایک پیکٹ دے ہی ڈالو ــــ''
''آج تو آپ کی چھٹی کا دن ہے بابو ــــ'' اس نے میرے برانڈ کا سگریٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔
''سڑک پر کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی ہے ــــ؟'' میں نے اس کا سوال اَن سنا کرتے ہوئے کہا۔
''بس والوں کی ہڑتال ہے، آپ کو نہیں معلوم؟ پٹرول، ڈیزل کے دام بڑھ جانے کے کارن ان لوگوں نے ہڑتال کر رکھی ہے۔''
''ٹیکسی اسٹینڈ کیوں خالی ہے؟'' میں نے دوسرا سوال جڑ دیا۔
''صبح اسٹینڈ میں ٹیکسیاں تھیں۔ لگتا ہے بس کے مسافروں نے ان پر قبضہ جما لیا ہے ــــ'' پھوٹک نے مسکرا کر کہا۔
میں نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا اور جیب میں لائٹر کے لیے ہاتھ ڈالا۔ پھوٹک نے نہایت سرعت سے ماچس کی تیلی جلا کر میری طرف بڑھا دی۔
میں نے مسکرا کر سگریٹ سلگایا۔ پیسے ادا کیے اور منہ سے دھوئیں کا مرغولہ نکالتے ہوئے ایک بار پھر کلائی گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج کر چالیس

منٹ ہو چکے تھے۔ٹیکسی اسٹینڈ اب بھی خالی تھا۔مجھے تشویش ہونے لگی۔تاخیر ہو رہی تھی۔گھڑی کی سوئیوں کی طرح میری پریشانیاں بھی آگے بڑھ رہی تھیں۔چیف میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔یقیناً کوئی اہم ضرورت آپڑی ہوگی ورنہ چھٹی کے دنوں میں وہ کسی کو دفتر میں کال نہیں کرتے ہیں۔

دفعتاً پھوٹک کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔''بابو ـــــ ٹیکسی!''

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔اسٹینڈ میں ایک ٹیکسی داخل ہو رہی تھی۔پلٹ کر پھوٹک کا شکریہ ادا کیا۔وہ مسکرایا۔میں تیزی سے اسٹینڈ کی طرف بڑھنے لگا۔

قریب پہنچ کر ڈرائیور کو ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔جلدی جلدی سگریٹ کے دو تین کش لیے اور پھر اسے اپنی انگلیوں سے آزاد کر کے اندر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ڈلہوزی چلو ـــــ''

گاڑی چل پڑی۔

میں چیف کے بارے میں سوچنے لگا۔اتنی کم عمری میں سلیقے سے کسی فرم کو چلانا آسان بات نہیں ہے۔اپنے کاروبار کے ساتھ ساتھ ملازمین کے دکھ سکھ کا خیال رکھنا وہ اپنا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔حد درجہ وقت کے پابند ہیں۔ڈسپلن کو زندگی کا صحیح اصول مانتے ہیں اور......

دفعتاً جیب میں پڑے ہوئے فون کی موسیقی ایک بار پھر فضا میں لہرائی۔میں نے اسے کان سے لگا کر ہلو کہا۔

''مسٹر تجمیل ـــــ؟''

''یس سر! میں پہنچ رہا ہوں۔''

''کہاں سے بول رہے ہو؟''

''سر، میری گاڑی ہوڑہ پل پر سے گزر رہی ہے۔بس چند لمحوں میں حاضر ہو رہا ہوں۔''

''اوکے ـــــ جلدی پہنچو ـــــ''

''یس سر ـــــ''

اُدھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

گاڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی۔راستے پر ٹریفک کم تھی۔ریاستی اور مرکزی حکومت کے دفاتر بند تھے اور اس پر طرّہ یہ کہ بس والوں کی ہڑتال بھی تھی۔

دھوپ کھلی ہوئی تھی لیکن موسم میں ٹھنڈک حسبِ معمول تھی۔

کلائی گھڑی پر نظر ڈالی۔بارہ بج رہے تھے۔

ریاستی سکریٹریٹ رائٹرز بلڈنگس کے قریب سے گزرتی ہوئی ٹیکسی جب آگے بڑھی تو میں نے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔

اس نے گاڑی فٹ پاتھ کے کنارے روک کر میٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''صاحب پچاس روپے!''

میں نے پرس سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے حوالے کیا اور اپنا بریف کیس لے کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔

ڈلہوزی جیسا مصروف ترین علاقہ خالی خالی نظر آ رہا تھا۔ منی بس ٹرمنس بھی سنسان تھا۔ نتیجتاً روزانہ کے ہاکرس بھی غائب تھے۔

راستہ پار کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا دفتر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا!

تین

چیف کے کمرے کے باہر بیٹھے ہوئے چپراسی نے کھڑے ہو کر مجھے سلام کیا۔

''صاحب اندر ہیں؟''

''جی ہاں ـــــ''اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔

چیف اپنے قیمتی سوٹ میں ملبوس کرسی پر دراز تھے۔ہلکے نیلے شرٹ پر سیاہ کوٹ بہت جچ رہا تھا۔جدید طرز کی سیاہی مائل چوڑی ٹائی ان کی شخصیت کو مزید جاذبِ نظر بنا رہی تھی۔

ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ہونٹوں میں سگار پھنسا ہوا تھا۔نظریں فائل پر تھیں اور ذہن کسی سوچ میں گم نظر آرہا تھا۔

''گڈ مارننگ سر!''

''یس گڈ مارننگ مسٹر شجیل۔''انھوں نے سگار کو اپنی انگلیوں کے حوالے کیا۔ہونٹوں پر استقبالیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔''کم اِن اینڈ ٹیک یور سیٹ ـــــ''

''جی شکریہ ـــــ''

''تمھیں آج ممبئی جانا ہوگا۔''انھوں نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''آج ہی ـــــ لیکن کیوں سر؟''میں حیران تھا۔

''بتاتا ہوں۔''انھوں نے ایش ٹرے میں سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''دراصل وہاں کے ایجنٹ نے خبر دی ہے کہ ویزا کے مطابق کلکتے سے تمام مسافر اب تک نہیں پہنچ پائے ہیں۔''

''ہم اس سلسلے میں کیا کرسکتے ہیں۔مسافروں کو ایک ہفتہ قبل رسید کے ساتھ اطلاع دی جاچکی ہے ـــــ''

''ایجنٹ کے بینک ڈرافٹ میں کچھ غلطیاں نکل آئی ہیں۔''انھوں نے میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔''میں نے فیکس بھیج دیا ہے اور تمھارے لیے ٹکٹ کا انتظام بھی کردیا ہے۔وہاں کا ایجنٹ تمھیں پہچانتا ہے اور ممبئی تمھارے لیے نئی جگہ نہیں ہے۔''انھوں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی

کردی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں ۔گفتگو ختم ہونے کا یہ اشارہ تھا۔

''اچھی بات ہے سر!'' میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

''تھینکس ـــــ'' انھوں نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

''بائی دی وے فلائٹ کتنے بجے کی ہے سر؟''

''سہ پہر کے پانچ بجے۔'' چیف نے آنکھیں کھول دیں اور ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔

''اس میں تمھارے لیے ٹکٹ اور کچھ ضروری کاغذات ہیں۔ اور یاد رکھنا۔تمھاری ہوشیاری اور قابلیت سے ہم لاکھوں روپے کے نقصان سے بچ جائیں گے- مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔''

''تھینک یو سر!''

میں نے لفافہ اپنے بریف کیس میں ڈالا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''وش یو گڈ لک ـــــ'' چیف نے مسکرا کر کہا۔

''تھینک یو ونس اگین سر!'' میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''سر۔ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟''

چیف نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''دفتر میں اور بھی لوگ ہیں۔ مجھ پر اس قدر بھروسے کا سبب؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''میرے پتاجی کہا کرتے تھے کہ تم لوگ بھروسے کے قابل ہو۔'' انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن بعض سرکل میں ہمیں انتہا پسند اور نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے؟''

''ہر کمیونٹی میں کچھ بلیک شپ ہوتے ہیں۔ ان سے پوری کمیونٹی کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اب جاؤ اور سفر کی تیاری کرو۔ گڈ بائی۔''

''گڈ بائی سر!''

میں کمرے سے باہر آ گیا۔

چیف کی باتوں سے خوشی بھی ہو رہی تھی اور فخر بھی۔ آج کے دور میں ایسے نیک خیالات رکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ ایسے بہترین انسان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے جسے اپنا چیف کہتے ہوئے اچھا لگتا ہے۔

سیڑھیوں سے نیچے پہنچ کر سڑک پر نظر دوڑائی۔ راستہ حسبِ معمول سنسان تھا۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔

جیب سے فون نکال کر سمر کا نمبر ملایا۔

''ہلو ـــــ!'' ادھر سے آواز آئی۔

''یار سمر ـــــ چیف نے ممبئی جانے کی ہدایت کی ہے اور آج ہی پانچ بجے کی فلائٹ ہے۔ پکنک کینسل کر دو اور پلیز مایا اور شانتی کو سمجھا دینا۔

اگلے ہفتے حالات سازگار رہے تو یقینا پکنک ہوگی ــــ''

''ارے ارے ــــ میری بھی سنے گا یا صرف اپنی ہی کہے جائے گا میرے بھائی۔''

''فی الحال بالکل مہلت نہیں ہے۔تیری پھر کبھی سنوں گا۔''

''لیکن میں ایک چھوڑ دو دو عورتوں کو کیسے سمجھاؤں میرے بھائی؟''

''کسی بہانے سے کام چلا لینا یار۔''

''کون سا بہانہ بناؤں؟''

''میرا خیال ہے ــــ انھیں سچ بتا دینا بہتر ہوگا۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''ممبئی سے واپسی پر ان لوگوں سے مل کر معافی مانگ لوں گا ــــ ٹھیک ہے؟''

''اچھی بات ہے میرے بھائی۔اور کوئی حکم؟''

''تین بجے سے کچھ پہلے میرے گھر پہنچو۔''

''سمجھ گیا میرے بھائی۔''

میں نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت ایک ٹیکسی سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔

ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کو کہا۔

چند لمحوں میں گاڑی قریب آ کر رک گئی۔ڈرائیور نے ہاتھ بڑھا کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

میں نے بریف کیس اندر رکھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔''ہوڑہ چلو۔''

ڈرائیور نے الیکٹرانک میٹر آن کیا اور جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھ گئی۔میں نے آنکھیں موند لیں اور اپنے آپ کو سفر کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ضروری سامان کی ایک چھوٹی سی فہرست بھی تیار کر لی۔سوچا کہ شانتی کو فون کر لوں، پھر خیال آیا کہ اسے فون پر تمام باتیں سمجھانا میرے بس کی بات نہیں۔سمجھدار ہونے کے باوجود وہ ضدی کچھ کم نہیں ہے۔ایسے موقعوں پر اس سے باتیں کرتے وقت لاجک کے ساتھ زبردست حکمتِ عملی کی ضرورت بھی پڑتی ہے اور اس کے لیے خاصا وقت درکار ہے جو اس وقت میرے پاس نہیں!

چار

سمر اپنی نیم پاگل دیدی کے ساتھ ہوڑہ کے بوکل تلہ کے علاقے میں کرائے کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ دو کمروں والے فلیٹ کا کرایہ اور دیدی کے علاج میں اس کی آدھی تنخواہ صرف ہو جاتی ہے۔ سرکاری ملازمت میں آنے سے قبل وہ کلکتے میں اپنے پھوپھا کے یہاں رہا کرتا تھا۔ تب دیدی اور ماں پرولیا میں رہتے تھے۔ اس کے پتاجی وہیں پوسٹ آفس میں کلرک تھے۔ پانچ سال قبل ملازمت سے سبکدوش ہوئے لیکن بدقسمتی سے اسی سال دماغی بخار نے حملہ کیا اور دیکھتے دیکھتے جاں بحق ہو گئے۔ پھر پنشن کی رقم سے گھر کے اخراجات پورے ہونے لگے اور سمر کا تعلیمی سلسلہ ہائر سیکنڈری تک پہنچ کر منقطع ہو گیا۔

مجبوراً اسے کلکتے آنا پڑا۔

یہاں اس کے پھوپھا کلیان چٹرجی نے مدد کی۔ راجرہاٹ میں ان کا دو منزلہ مکان تھا۔ میاں بیوی کے علاوہ ایک بیٹا تھا جو دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ پھوپھا بڑا بازار میں ایک مارواڑی کے شوروم میں سینئر اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ملازمت کرتے تھے۔ پروپرائٹر شریف انسان تھا۔ پھوپھا کے کام سے بہت خوش رہا کرتا تھا۔ دوسرے اسٹاف کی بہ نسبت ان پر زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ سمر کا خیال تھا کہ پھوپھا چاہتے تو اس شوروم میں اسے بھی ملازمت مل جاتی لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ سمر جیسے ذہین لڑکے کو وہاں رہ کر برباد ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

بہر کیف پھوپھا کے توسط سے سمر کو فوری طور پر دو تین ٹیوشن مل گئے۔ اسے کچھ سہارا ملا۔ کچھ دنوں بعد ٹیوشن میں اضافہ ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہاں مفت کی روٹیاں توڑنے سے کسی میس میں رہنا بہتر ہو گا۔

اس نے ایک دن ان کے آگے مدعا بیان کیا۔

''بالکل نہیں ــــ'' پھوپھی نے سنتے ہی انکار کر دیا۔

پھوپھا خاموشی سے مسکرائے۔

''یہاں کب تک یوں ہی پڑا رہوں ــــ؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''جب تک ٹھاکر کی دیا سے تمھیں اچھی سی نوکری نہیں مل جاتی۔''

''لیکن پھوپھی! تمھارے ٹھاکر کی دیا سے ایک ہائر سیکنڈری پاس نوجوان کو کلکتے میں اچھی نوکری نہیں مل سکتی۔''

''کیوں نہیں مل سکتی۔ میں کل ہی سویرے اشنان کے بعد ٹھاکر سے تمھارے لیے پرارتھنا کروں گی۔''

''میرا خیال ہے ــــ'' پھوپھا نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔''تم بی اے میں ایڈمیشن لے لو۔اور ٹیوشن کے ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھو۔ یہ سچ ہے کہ آج کل نوکری کے لیے صرف ہائر سیکنڈری پاس ہونا کافی نہیں ہے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے ــــ'' پھوپھی نے کہا۔

''میں آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا ــــ''سمر نے لاچاری سے کہا۔

''اوپر والا کمرہ چھوڑ کر نیچے آجاؤ۔ برابر میں رہو گے تو بوجھ ہم پر نہیں زمین پر پڑے گا۔'' پھوپھا نے مسکرا کر کہا۔

سمر لاجواب ہو کر رہ گیا۔

اس کی بے چارگی پر پھوپھی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایک کام کرو۔ دوسرے بچوں کے ساتھ بلٹو کو بھی ٹیوشن دے دیا کرو۔ ہم سے فیس مت لینا۔''

سمر نے ان لوگوں کے والہانہ پیار اور شفقت کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

پہلی فرصت میں اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ صبح و شام بچوں کو پڑھاتا اور دن میں خود کالج میں حاضری دیتا۔

اسی زمانے میں اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

لائبریری میں اپنی مطلوبہ کتاب نہ پا کر وہ بہت اداس تھا۔ لائبریرین نے اسے بتایا کہ وہ کتاب میرے نام ایشو ہو چکی ہے۔

وہ کلاس روم میں مجھ سے ملا۔

''میرا نام سمر ہے۔''اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں تجمیل ــــ''

''معلوم ہے ــــ'' وہ مسکرایا۔

''کیسے ــــ؟''

اس نے مسکراتے ہوئے مطلوبہ کتاب اور لائبریرین کا ذکر کیا اور مجھ سے گزارش کی کہ میں کم از کم ایک دن کے لیے وہ کتاب اس کے حوالے کر دوں۔

میں نے ایک دن کی بجائے ایک ہفتے کے لیے کتاب اسے دے دی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ بار بار میرا شکریہ ادا کرتا رہا۔

بعد ازاں دھیرے دھیرے ہم میں دوستی ہو گئی۔

ایک مرتبہ پوجا کی چھٹیوں کے بعد وہ کالج میں بڑا اداس نظر آیا۔ پوچھنے پر بتایا کہ اس کی دیدی کی بیماری میں کوئی افاقہ نہیں ہو رہا ہے۔ ماں پریشان ہے۔ یہاں کلکتے میں علاج سے فائدہ ہو سکتا ہے لیکن اخراجات کو سنبھالنا اس کے بس سے باہر ہے۔

''دیدی کو کیا تکلیف ہے۔''میں نے اپنائیت سے پوچھا۔

''سیزوفرینیا ــــ''

بیماری کا نام سن کر میں حیران رہ گیا۔ سیزوفرینیا کا مریض پورے کنبے کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ اس بیماری میں مریض کا ذہن کام کرنا

چھوڑ دیتا ہے ـــــ ہاتھ پاؤں سے اپاہج پھر بھی غنیمت ہے لیکن ذہن سے مفلوج انسان ـــــ خدا کی پناہ!

''دیدی کو یہ بیماری کب سے ہے ـــــ؟'' میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

''کلاس نائن میں پڑھتی تھی۔ اچھی اسٹوڈنٹ تھی۔ ہر سال کلاس میں فرسٹ آتی تھی۔ انٹلی جینٹ اتنی کہ ایک بار جو چیز پڑھ لیتی پھر کبھی نہیں بھولتی۔ ایک دن کلاس ٹیچر نے غلطی سے اسے بلاقصور بینچ پر کھڑے ہونے کی سزا دے ڈالی۔ معمولی سی بات تھی لیکن نہ جانے کیوں اسی دن سے پڑھائی میں اس کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ ہم لوگوں نے بہت سمجھایا۔ ٹیچر نے بھی اپنی غلطی پر افسوس ظاہر کیا۔ لیکن کلاس میں آدھے گھنٹے تک کھڑے ہونے کی سزا نے اسے ذہنی طور پر ایسی تکلیف پہنچائی کہ اس کے بعد پھر کبھی وہ نارمل اسٹوڈنٹ کی طرح بی ہیو نہیں کر پائی۔''

''کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کیا؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھا۔

''پتاجی اس وقت زندہ تھے۔ انھوں نے پرولیا کے ایک بڑے ڈاکٹر سے دیدی کا علاج کرایا۔ لیکن افسوس کہ ایک سال بعد وہ خود ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ ان کی پنشن سے گھر کا خرچ اور دیدی کا اچھا علاج پوسیبل نہیں تھا۔ مجبور ہو کر مجھے اپنی پڑھائی روک دینی پڑی تا کہ دیدی کا علاج کسی طرح جاری رہ سکے۔ اس کے باوجود بیماری میں کمی نہیں آئی۔ ڈاکٹر نے دوائیں جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور یہی بتایا کہ عمر کے ساتھ ممکن ہے بیماری میں کمی آجائے۔ لیکن اب بھی معاملہ ویسا ہی ہے ـــــ''

''دیدی کی عمر کیا ہے ـــــ؟''

''تیس کراس کر چکی ہے۔ اس کی کئی سہیلیوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اب تک ـــــ''

''تیس کی عمر کوئی زیادہ نہیں ہوتی۔'' میں نے از راہِ ہمدردی کہا۔

''افسوس اسی بات کا ہے کہ وہ یہ جان چکی ہے کہ ایسی حالت میں اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔''

''حوصلہ رکھو۔'' میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تقدیر میں ہوگا تو دیدی یقیناً صحت یاب ہو جائے گی۔''

''معاف کرنا۔ میں تقدیر و قدیر کو نہیں مانتا۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ حالات کے سبب ہوتا ہے اور کچھ نہیں ـــــ'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

مجھے اس کی بات تھوڑی دیر کے لیے بری لگی لیکن میں نے بحث کرنے کی بجائے اسے تسلی دینا ضروری سمجھ کر کہا۔

''بہر کیف، کم از کم اس بات کی امید رکھنی چاہیے کہ حالات کبھی بہتر ہوں گے۔''

''معلوم نہیں ـــــ'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

فائنل امتحانات ختم ہوتے ہی خبر آئی کہ اس کی ماں غسل خانے میں گر پڑی ہے اور جسم کا دایاں حصہ مفلوج ہو گیا ہے۔

وہ گھبرایا گھبرایا سا پرولیا روانہ ہوا۔

بعد میں اس نے بذریعہ خط اطلاع دی کہ ماں گزر گئی۔

بدقسمتی سے پنشن کی رقم بھی آنا بند ہو گئی۔ دیدی کا علاج تقریباً رک گیا۔ بیماری بڑھنے لگی۔ سمر نے دیدی کو اپنے ماموں کے حوالے کیا اور کچھ دنوں تک اس کی دیکھ بھال کی گزارش کی۔ ماموں کو رحم آگیا۔ انھوں نے ہامی بھر لی۔

ادھر امتحانات کے نتائج شائع ہو گئے۔

امید کے مطابق سمر نے امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔اس نے خوشی منانے کی بجائے وقت ضائع کیے بغیر مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاریاں شروع کر دیں۔

قدرت مہربان ہوگئی اور سمر ڈلہوزی میں ایک سرکاری دفتر میں ملازمت سے لگ گیا۔اس نے پہلی فرصت میں ایک فلیٹ کرایے پر لیا اور دیدی کو پرولیا سے یہاں بلایا۔

کبھی کبھی پھوپھا پھوپھی کو دیکھنے جایا کرتا ہے۔وہ اکثر ان کے احسانات گنواتا ہے اور ان کے لیے دل سے دعائیں کرتا رہتا ہے!

پانچ

سمر کی دیدی کا نام اپرنا ہے۔ ہم لوگ صرف دیدی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ مجھے ان سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ سمر کے گھر پر پہلی نظر میں انہیں دیکھتے وقت قطعی احساس نہیں ہوا کہ وہ سیزوفرینیا کی شکار ہیں۔ ناک نقشہ یا جسم کی بناوٹ ہر لحاظ سے وہ ایک مکمل عورت نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی ترس آتا ہے کہ ایسی بھولی بھالی عورت کے ساتھ قدرت نے یہ کیسا مذاق کیا ہے۔

سنیچر کی شام سمر کے گھر پر ہم لوگ مدعو تھے۔ مایا اور شانتی نے مل کر بے حد لذیذ کھانا پکایا۔ دیدی نے بھی بساط بھر ان کی مدد کی۔ مایا نے چلی چکن بنایا۔ شانتی نے فرائڈ رائس اور دیدی نے چھولے کی پکوریاں، میٹھا دہی اور رس گلے بھی دسترخوان پر موجود تھے۔ یہ سمر اور مایا کی تنخواہوں میں سالانہ اضافے کا موقع تھا۔

''گرم گرم پکوریوں کا جواب نہیں۔'' میں نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''اچھی ہیں ـــــ؟'' دیدی نے مسکرا کر پوچھا۔

''بہت اچھی ہیں۔''

''تو کھاؤ ـــــ رک کیوں گئے؟''

''فرائڈ رائس بھی تو کھانا ہے۔'' شانتی مسکرائی۔

''ضرور ضرور ـــــ'' میں نے کہا ''لگتا ہے کہ آج میں کسی کی شادی کی دعوت میں شریک ہو رہا ہوں۔''

''ذرا ہاتھ ہٹانا۔'' شانتی نے میری پلیٹ میں فرائڈ رائس ڈالتے ہوئے کہا۔

''چلی چکن تمھیں پسند نہیں؟'' مایا درمیان میں بول پڑی۔

''ہاں ہاں ـــــ کیوں نہیں۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''کھاؤ کھاؤ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں میرے بھائی۔'' سمر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ذبح کیا ہوا مرغا ہے اصغر علی کی دکان کا۔''

''دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی ـــــ اور تم ابھی تک اسی چکر میں پڑے ہوئے ہو؟'' شانتی نے از راہِ مذاق مجھے چھیڑا۔

''مذہبی معاملات میں مجھے مذاق بالکل پسند نہیں۔'' میں نے برا ماننے کی اداکاری کی۔

''بالکل صحیح ـــــ مگر سچ تو یہ ہے میرے بھائی کہ یہ صرف مذہبی معاملہ نہیں ہے۔اس میں تو سائنٹفک ریزن بھی ہے۔مجھے معلوم ہے کہ ذبح کیا ہوا گوشت کمپریٹیولی اَن ہارم فُل ہوتا ہے۔''

''کیسے بھلا؟''شانتی بولی۔

''وہ اس طرح کہ ذبح کے وقت جانور کے جسم کا سارا خون بہہ کر باہر نکل جاتا ہے جب کہ جھٹکے سے مارنے میں ایسا نہیں ہوتا۔اکثر جسم میں کہیں کہیں خون رہ جاتا ہے جس سے کھانے والا کبھی کبھی بیمار بھی پڑ سکتا ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ......''شانتی ہاتھ آئے ہوئے موقع کو جانے دینا نہیں چاہتی تھی،بولی''تجمل ذبح کیا ہوا گوشت مذہبی پوائنٹ آف ویو سے پسند کرتا ہے یا ہیلتھ گراؤنڈ پر؟''

میرے کچھ کہنے سے قبل مایا نے فرائڈ رائس کا نوالہ اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا''میں سمجھتی ہوں کہ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ایز اِٹ اِز چھوڑ دینا چاہیے۔یہی سب سے اچھی پالیسی ہے۔''

میں مایا کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔

دفعتاً سمر نے ٹوکا''یہ اچھی بات نہیں ہے!میری مایا کو اس طرح گھورنے کا کیا مطلب ہے،وہ بھی شانتی کے سامنے میرے بھائی ـــــ''

''نہیں ـــــ میں تو ایسے ہی ـــــ''

''بس بس ـــــ اب کھانا ختم کرو اور اٹھو ـــــ''شانتی نے کہا۔

''کیوں ـــــ دہی اور رس گلے؟''میں نے پوچھا۔

دیدی مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگیں۔

''وہ اصغر علی کی دکان کے نہیں ہیں۔''شانتی شرارت سے بولی۔

''اب تم تجمل کے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔''مایا نے اسے ٹوکا۔

''کرنے دو زیادتی ـــــ وقت آنے پر گن گن کے بدلے لینا میرے بھائی۔''

''بدلے کی بھاؤ نا ٹھیک نہیں ـــــ''مایا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''کیوں ـــــ ٹٹ فار ٹائٹ''سمر نے کہا۔

''نہیں ـــــ اس سے دشمنی بڑھتی ہے۔''

''اچھا؟ پیار کیسے بڑھتا ہے؟''سمر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''پیار بڑھتا ہے ـــــ''اچانک کہتے کہتے مایا جھینپ گئی۔پھر مصنوعی غصے سے بولی''شرارت؟''

''اچانک تم ہماری ٹھاکر ماں(دادی)کیوں بن جاتی ہو؟''

''تم لوگ بچے کیوں بن جاتے ہو؟''اس نے برجستہ جواب دیا۔

''تم سے بحث میں جیتنا مشکل ہے۔''

''اب آئے صحیح راستے پر ـــــ''

''میرے پتاجی کہا کرتے تھے کہ عورتوں سے بحث میں ہار جانے میں بھلائی ہے۔''سمر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''بالکل سچ کہتے تھے وہ۔''

''مگر وہ یہ بھی کہتے تھے کہ عورتوں کے ساتھ ـــــ'' کہتے کہتے سمر یکا یک خاموش ہوگیا۔

''کیا کہتے تھے؟''مایا نے تجسس سے پوچھا۔

''کھانے کے دوران بحث نہیں کرنی چاہیے۔''میں نے جملہ پورا کرنے کی کوشش کی۔

''کھانے کے دوران تو بڑی بڑی سرکاری اور غیر سرکاری میٹنگیں ہوتی ہیں۔''

''تم الٹا بول گئی۔ کھانے کے وقت میٹنگ نہیں بلکہ میٹنگ کے وقت کھانا ہوتا ہے۔''سمر نے مسکرا کر کہا۔

''بات ایک ہی ہے۔''

''نہیں ـــــ''سمر اڑا رہا۔

''ارے ـــــ کھانا بھی تو کھاؤ ـــــ'' دیدی مسکرا کر بولیں۔

''شانتی بحث سے محظوظ ہو رہی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بے شک مجھے چھیڑتی ہے۔ کبھی کبھی نیچا دکھانے کی کوشش بھی کرتی ہے لیکن اس کے باوجود دل کی اچھی ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ ایسے لوگ ہی عموماً اچھے انسان ثابت ہوتے ہیں۔

''پہلے دہی لوگے یا رس گلے؟''شانتی نے مجھ سے پوچھا۔

''جو تمھیں پسند ہو۔''

''رس گلے ـــــ''مایا بیچ میں بول پڑی۔

''کیوں ـــــ؟''

''دہی سب سے آخر میں۔''

''کیوں ـــــ؟''

''دہی سے سب کچھ سہی (صحیح) ہو جاتا ہے۔''مایا مسکرائی۔

میرے لبوں پر بھی مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں نے سمر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مایا سے شادی کر کے تم فائدے میں رہو گے۔''

''کیسے میرے بھائی ـــــ''

''وہ کسی بھی معاملے میں جلدی فیصلہ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔''

''لیکن مجھ سے شادی کا فیصلہ اب تک نہیں لے پائی میرے بھائی۔''سمر نے برجستہ کہا۔

شانتی اور میں نے مایا کی طرف دیکھا لیکن اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی دیدی ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور بیسن کی

طرف چلی گئیں۔

''کیا ہوا ــــ؟''میری زبان سے نکلا۔

سمر نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں تک لے جا کر مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔

میں نے شانتی کی طرف دیکھ کر اشارے سے پوچھا۔

''کچھ بھول ہوگئی؟''

اس نے شانے اُچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

مایا بھی حیران تھی۔

اس دوران دیدی نے ہاتھ دھو کر اسے تولیہ سے خشک کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

''کیا ہوا ــــ؟''اس مرتبہ شانتی نے سمر سے پوچھا۔

''لگتا ہے ہماری زبان سے شادی کا ذکر سن کر شاید......''سمر نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر چند ثانیوں کے بعد آہستہ سے کہا''دیدی کے لیے سات قسم کی دوائیں اور ستر قسم کے احتیاطوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ بے چاری نہ جانے کس جنم کی سزا بھگت رہی ہیں۔''

ہم دیدی کی بیماری کے بارے میں سوچ کر افسوس کرنے لگے۔ خوش گوار ماحول میں ذراسی بے احتیاطی کے سبب اداسی کی فضا چھاگئی۔

چند لمحوں بعد سمر کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

''کوئی بات نہیں ــــ''اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا''تھوڑی دیر بعد دیدی آپ ہی نارمل ہو جائے گی۔''

میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا''خواہ مخواہ تمھاری شادی کی بات چھیڑ دی، ذرا بھی علم ہوتا تو......''

''نیور مائنڈ میرے بھائی، دیدی کو تھوڑی دیر بعد شاید یہ سب کچھ یاد بھی نہ رہے۔''

شانتی اور مایا کے چہرے پر افسوس اور حیرت کے آثار نمایاں تھے!

چھ

سمر کی بار بار کی گزارش پر ایک مرتبہ ہم لوگ یعنی میں، سمر، مایا اور دیدی پرولیا کے سفر پر روانہ ہوئے۔ رات کے ساڑھے دس بجے ہوڑہ اسٹیشن سے 315-UP چکردھر پور پسنجر ٹرین کے ذریعہ ہم صبح سویرے پرولیا اسٹیشن پہنچے۔ فروری کا مہینہ تھا اور خوش گوار موسم۔ زیادہ گرمی تھی نہ زیادہ سردی اس لیے سفر میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

ہم اسٹیشن سے بذریعہ رکشا بس اسٹینڈ پہنچے۔

وہاں سمر نے ایک جیپ والے کو آواز دی۔

''کہاں جانا ہے بابو؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

سمر نے اپنے گاؤں کا نام بتایا اور ہمیں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔

انجن کی ہلکی سی آواز کے ساتھ جیپ چل پڑی۔

تھوڑی ہی دیر میں جیپ شہر کی بھیڑ بھاڑ سے نکل کر ایک سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے سرسراتے ہوئے گذر رہے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر برگد اور پلاس کے درختوں کا سلسلہ تھا۔ دائیں بائیں ہرے بھرے کھیت آنکھوں کو تازگی بخش رہے تھے۔ دھان کی بالیاں جھوم رہی تھیں۔ کنارے سے ایک نہر نکلی تھی۔ کہیں کہیں کھجور اور ناریل کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ شانتی اور مایا خوبصورت موسم اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ دیدی آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہی تھیں۔ سمر کے ہاتھوں میں بنگلہ زبان کا کوئی مقامی اخبار تھا جسے اس نے اسٹیشن کے اسٹال سے خریدا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم شہری قدرت کی رنگینیوں سے کس قدر دور رہ کر جیتے ہیں۔ شہر کے گرد و غبار اور زہریلے دھوئیں سے بھری ہوئی فضا میں قدرت کی یہ صناعی کہاں ـــــ؟

دفعتاً شانتی نے مجھے مخاطب کیا۔

''سبزے کی چادر اوڑھے دھرتی کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔''

''اور صبح کے سورج کی سنہری کرنوں نے اسے اور بھی خوبصورت بنا دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''موسم بھی کتنا سہانا ہے۔'' مایا بولی۔

''تم لوگوں نے یہاں آ کر شاعری شروع کر دی۔''سمر نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''یہ شاعری نہیں قدرت کی خوبصورتی کا اعتراف ہے۔''میں نے جواب دیا۔

''بے شک بے شک۔''شانتی اور مایا نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔

تھوڑی دیر بعد سمر نے ڈرائیور کو اونچی آواز میں رکنے کی ہدایت کی۔

گاڑی چکنی سڑک پر پھسلتے پھسلتے ایک کنارے پہنچ کر رک گئی۔

سمر نے کرایہ ادا کیا۔ہم اپنے اپنے سامان کے ساتھ گاڑی سے نیچے اتر گئے۔

''آہستہ آہستہ میرے پیچھے آؤ ـــــ''سمر نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا اور خود راستہ سے نیچے اتر کر کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی پگڈنڈی پر چل پڑا۔

ہم اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔دھان کی بالیوں پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ہتھیلیوں سے مس کرتے ہوئے ٹھنڈک اور تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔

''یہاں سے سیدھے جا کر دائیں طرف گلی میں مڑتے ہی دوسرا مکان اپنا ہے۔''سمر نے مڑ کر کہا۔

وہاں پہنچ کر دیکھا۔خوبصورت جگہ تھی۔چھوٹے سے تالاب میں درخت کی پتیاں گری ہوئی تھیں۔ایک کنارے پڑے پتھروں کو آگے پیچھے سجا کر نیچے اترنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔مکان کے چاروں طرف تار سے بنی ہوئی باڑھ تھی۔موٹے موٹے تختوں کو کاٹ کر دروازہ بنایا گیا تھا جس میں زنگ آلود زنجیر تھی اور بیچ میں پرانے طرز کا بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔

سمر نے جیب سے کنجی نکالی اور تالا کھول کر کواڑ کو اندر دھکیلتے ہوئے کہا۔

''سب لوگ آجاؤ۔''

ہم اندر داخل ہوئے۔

مٹی کی موٹی موٹی دیواروں والے تین کمروں،ایک باورچی خانے اور ایک غسل خانے پر مشتمل یہ مکان پرانا ضرور تھا لیکن کافی مضبوط لگ رہا تھا۔ہر کمرے میں بجلی کے بلب لگے ہوئے تھے۔سب سے بڑے کمرے میں ایک پرانا ٹرانسسٹر بھی نظر آیا۔چاروں طرف سے گھرا ہوا ایک بڑا سا آنگن۔اس کے ایک کنارے نیم کا درخت اور پاس ہی ایک چھوٹا سا کنواں ـــــ پرانا سا ایک ہینڈ پمپ بھی نظر آرہا تھا۔

''دیدی!اس قدر چپ چپ کیوں ہیں؟''مایا نے یوں ہی پوچھ لیا۔

درو دیوار پر نظر ڈالتے ہوئے غالباً وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔لیکن بیماری نے حافظے کو مفلوج کر دیا تھا۔کوشش میں ناکامی کے سبب ان کے چہرے پر تناؤ نظر آرہا تھا۔مجھے ان کی حالت دیکھ کر ایسا لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔

''کیا ہوا دیدی؟''میں نے انہیں سہارا دینے کی نیت سے کہا۔

وہ میری طرف بے بسی سے دیکھنے لگیں۔

''کوئی تکلیف؟''

دفعتاً ان کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

’’کیا ہوا دیدی ——؟‘‘

’’کچھ نہیں ——‘‘ وہ تقریباً چیخ پڑیں۔

شانتی موقع بھانپ کر فوراً بول پڑی۔

’’عرصہ بعد اپنے جنم استھان کو دیکھ کر ایسا ہوتا ہے۔ تمھیں نہیں معلوم؟‘‘

’’یہ کون سی نئی بات ہے —— کوئی بھی بے وقوف یہ سمجھ سکتا ہے۔‘‘

’’اسی لیے تو چاہتی ہوں کہ تم سمجھ جاؤ۔‘‘ شانتی کے اس زوردار حملے سے میں جھینپ گیا لیکن دیدی کے ساتھ سبھی لوگ ہنس پڑے۔

سمر نے مڑکر دیدی سے کہا۔

’’سب کو اندر والے کمرے میں بٹھاؤ۔ میں کام کرنے والی ماسی کو بلاتا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ دیدی نے کہا۔

اتنی جلدی ان کی حالت میں تبدیلی سے ہم حیران بھی تھے اور خوش بھی۔

سمر تیزی سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں ماسی آ گئی۔ آناً فاناً کمروں کی صفائی ہو گئی۔ سوکھے پتوں سے بھرا ہوا آنگن بھی صاف ستھرا نظر آنے لگا۔

ناشتے کے لیے ہم سلائس اور مکھن ساتھ لائے تھے۔ مایا نے جلدی سے چائے بنا ڈالی۔ ماسی کھانا بنانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔

دو پہر کے ڈیڑھ بجے ہم غسل سے فارغ ہو کر کھانا کھانے کے لیے بڑے کمرے میں جمع ہوئے۔ فرش پر دسترخوان بچھایا گیا۔ دال، چاول، دو قسم کی سبزیاں، اچار، ٹماٹر کی چٹنی —— مزہ آ گیا۔

کھانے کے بعد ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا۔

سہ پہر کے وقت آنگن میں چارپائی ڈالی گئی۔ پڑوس کے کچھ لوگ ہم سے ملنے آ گئے۔ شروع ہوا گپ شپ کا ماحول۔ گاؤں کے حالات پر تبصرہ، مقامی سیاسی و سماجی رہنماؤں کے اچھے برے کارناموں کا ذکر۔ درمیان میں ماسی چائے بسکٹ دے گئی۔

’’ایسا اڈہ پہلے کبھی دیکھا ہے؟‘‘ سمر نے خوشی کے لہجے میں مجھ سے پوچھ لیا۔

اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا سامنے بیٹھی مایا نے مسکرا کر کہا ——

’’اڈہ بازی میں ہم بنگالیوں کا جواب نہیں۔‘‘

میں مسکرا کر رہ گیا۔

رات آٹھ بجے تک محفل جمی رہی۔ ذرا بھی بوریت کا احساس نہیں ہوا۔ اگر ماسی نے آ کر ’’کھانا تیار ہے‘‘ کا الارم نہ دیا ہوتا تو محفل کچھ دیر اور جمی رہتی۔

اگلے دن پوس میلہ تھا۔

سمر نے بتایا کہ وہاں کے لوگ اسے ’’ٹوسو‘‘ کہتے ہیں۔ عورتیں اس سے قبل والے دن ’’اُپاس‘‘ (فاقے سے) رہتی ہیں۔ دوسرے دن سب

لوگ میلہ گھومنے نکلتے ہیں۔

''ٹوسو'' دراصل محرم کے تعزیے سے ملتی جلتی ایک شے ہے جسے لے کر لوگ سڑکوں پر نکلتے ہیں اور آخر میں وہاں کی کنگسا بتی ندی میں بہا دیتے ہیں۔گاؤں کے کسی ایسے میلے میں شریک ہونے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔رنگ برنگے لباس میں مرد عورتیں بچے بہت بھلے لگ رہے تھے۔

تیسرے دن سمر کے ماموں کے گھر پر ہم مدعو تھے۔گاؤں کے بالکل آخری کنارے پر ان کا مکان تھا۔انھوں نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔مامی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

ان کے تالاب سے مچھلیاں نکالی گئی تھیں۔

دسترخوان پر مچھلیوں کی تین قسم کی ڈشیز سجائی گئیں۔کھانا اتنا لذیذ تھا کہ ہم سب انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔

اگلے دن ہماری واپسی تھی۔

316-DN چکردھرپور رات کے آٹھ بج کر سترہ منٹ پر وہاں سے ہوڑہ کے لیے روانہ ہوئی۔

سب کچھ بہت اچھا رہا۔بہت مزہ آیا۔سوائے دیدی کی بیماری کے جو موقع موقع سے مور کے پاؤں کی یاد دلا تی رہی تھی!

سات

میں گھر سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

اٹیچی کھول کر سامان اور ضروری کاغذات پر آخری نظر ڈالی۔ پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ سہ پہر کے تین بجنے والے تھے۔ سمر نے ایئر پورٹ تک ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب تک اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ کمبخت نہ جانے کہاں رہ گیا۔ ایسے موقعوں پر ایک ایک لمحہ گراں گزرتا ہے۔

دفعتاً کسی خیال کے تحت میں نے اونچی آواز میں ماں کو پکارا۔

''ابھی آئی ـــــ'' دوسرے کمرے سے اس کی آواز آئی۔

''میری ڈائری کہاں گئی؟''

''وہیں دراز میں تھی۔'' ماں نے ہاتھوں میں ایک سیاہی مائل کوٹ لیے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

''کہاں ہے ـــــ؟''

''پہلے یہ کوٹ پہن لے۔ میں دیکھتی ہوں۔''

''مل گئی ـــــ'' میں نے دراز میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

ماں مسکرائی۔

''خود کو چھبیس برس کا کہتا ہے اور عادت اب بھی چھ برس والی ہے۔''

''ماں ـــــ تمھارے لیے ممبئی سے کیا لاؤں؟'' میں نے کوٹ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

''کیا لائے گا ـــــ جس کام کے لیے جا رہا ہے اسے سچی لگن اور ایمان داری سے کر کے واپس آجانا بس۔''

''وہ تو کروں گا ہی ـــــ چیف کو مجھ پر بھروسہ جو ہے۔ لیکن تمھارے لیے کیا لاؤں؟''

''مجھے جس چیز کی خواہش ہے وہ یہیں مل جائے گی ـــــ لائے گا؟''

''اوہ ماں!''

''اب مجھ سے گھر کا کام نہیں ہو پاتا ـــــ''

''کیوں ـــــ آج بائی نہیں آئی؟'' میں نے آئینے میں ٹائی کی گرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''آئی تھی۔ مجھے اس کے کام کاج کا طریقہ اچھا نہیں لگتا۔''

''کیوں؟''

''بس پسند نہیں۔''

''تو دوسری لا دوں؟''

''تو نہیں سدھرے گا۔'' ماں نے بناوٹی غصے سے کہا۔

''ماں۔ تمھارے لیے ایک خوش خبری ہے۔''

''کون سی ـــــ؟''

''میں بہت جلد سدھرنے والا ہوں۔''

''اللہ کرے وہ دن جلد آئے۔'' ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ بات تو رہ ہی گئی۔''

''کون سی ـــــ؟'' ماں نے رک کر کہا۔

''ممبئی سے تمھارے لیے ـــــ''

''وقت ملے تو حاجی علی سے شیرینی لیتے آنا۔''

''انشاءاللہ!''

''تیرا دوست سراب تک نہیں آیا ـــــ؟''

''آتا ہی ہوگا ـــــ''

''میں حاضر ہوں میرے بھائی ـــــ'' دروازے پر سے سمر کی آواز آئی۔

''چلتا ہوں ماں ـــــ'' میں نے اٹیچی اٹھائی۔

سمر نے میرے ہاتھ سے اٹیچی لیتے ہوئے کہا۔

''میں کس مرض کی دوا ہوں۔ چلو جلدی نکلو۔ سڑک پر ٹیکسی انتظار کر رہی ہے۔ پلین کا ٹکٹ اور پرس جیب میں رکھ لیا ہے میرے بھائی؟''

''ہاں ہاں۔ سب چیک کر لیا ہے۔ چلتا ہوں ماں۔ خدا حافظ۔''

''ماں جی۔ میرا بھی خدا حافظ ـــــ'' سمر نے مسکرا کر کہا۔

''جیتے رہو ـــــ'' ماں کے ہونٹوں پر وداعی مسکراہٹ نمایاں تھی۔

ایئر پورٹ پر مسافروں کی اچھی خاصی بھیڑ نظر آئی۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے سمر نے مسکرا کر کہا۔

''ممبئی کی لڑکیوں سے ہوشیار رہنا میرے بھائی۔''

''کیوں ـــــ کیا وہ مجھے کھا جائیں گی؟''

''اگر کھا گئیں تو شانتی کا کیا ہوگا میرے بھائی؟''

''میں وہاں دو تین دنوں کے لیے جا رہا ہوں ـــــ کام کے سلسلے میں۔ رہنے کے لیے نہیں۔ کام ختم ـــــ قیام ختم۔''

''دو تین دن تو بہت ہوتے ہیں۔ یہاں دو تین گھنٹے میں کیا کچھ نہیں ہو جاتا ہے میرے بھائی۔'' سمر بڑے موڈ میں لگ رہا تھا۔

''ہاں یہ بات صحیح ہے۔ لیکن آدمی کو اپنے اوپر بھروسہ رکھنا چاہیے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

اور اس سے قبل کہ سمر کچھ اور کہتا ممبئی جانے والے مسافروں کی آخری کال سن کر میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہہ کر ایئر وڈرم کی طرف چل پڑا۔

ہوائی جہاز کا سفر میرے لیے نیا نہیں ہے۔ اس سے قبل دفتر کے کام کے سلسلے میں دو مرتبہ ممبئی جا چکا ہوں۔ ایک مرتبہ دہلی کا سفر بھی کر چکا ہوں۔ اس لیے مجھے کوئی گھبراہٹ تھی نہ زیادہ خوشی۔ میں نارمل انداز میں اپنے جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دفعتاً جیب میں پڑے فون کی موسیقی بج اٹھی۔ مانیٹر پر دیکھ کر کہا۔

''ہلو ـــــ مایا۔ کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔ لیکن شانتی تم سے ناراض ہے۔''

''بغیر بتائے ممبئی جا رہا ہوں اس لیے؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں ـــــ اور تم نے پکنک بھی کینسل کر دی۔''

''کیا کروں۔ مجبوری ہے۔''

''تم نے شانتی کو فون کیوں نہیں کیا۔؟''

''فون پر اطلاع دے کر میں اسے مزید تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا۔ گھبراؤ نہیں۔ واپس آ کر منا لوں گا۔ فی الحال تم میرا ایک کام کر دو پلیز!''

''بولو ـــــ'' اس کی آواز میں بد دلی تھی۔

''میری طرف سے شانتی سے معافی مانگ لینا۔ ممبئی سے تمہارے لیے اچھا سا گفٹ لیتا آؤں گا۔''

''رشوت دے رہے ہو۔''

''تحفے کو رشوت نہیں سمجھنا چاہیے۔ اچھا بائی۔''

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

تمام مسافر جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔

میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا!

آٹھ

ایئر بس کے اندر پہنچ کر دیکھا۔ تمام نشستیں پُر ہو چکی تھیں۔

ایئر ہوسٹس کی مدد سے میں اپنی نشست تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ٹائی کی گرہ تھوڑی سی ڈھیلی کر کے نشست پر پھیل گیا اور مایا کے بارے میں سوچنے لگا۔ کالج کے زمانے میں بہت شوخ و طرار ہوا کرتی تھی۔ اب حالات کے تھپیڑوں نے سنجیدہ بنا دیا ہے۔

جہاز کے اڑتے ہی میرے ذہن نے بھی اڑان لی۔

دو برس قبل کالج سے گریجویٹ کی حیثیت سے نکلنے کے بعد مایا نے ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کیا تھا کہ بدنصیبی نے اسے مانک سے ملا دیا۔ خود کو بارسوخ اور نیک سیرت بتا کر وہ مایا کے قریب آنے لگا۔ ملازمت کی امید میں مایا بھی اس سے قریب تر ہونے لگی۔

ضعیف باپ کی گرتی ہوئی صحت۔ ان کی پنشن کی قلیل رقم۔ دو چھوٹی بہنوں کی تعلیم کا خرچ اور گھر والوں کی دیگر ذمے داریوں کا بوجھ...... یہ سب مل کر مایا سے بار بار ایک ہی مطالبہ کر رہے تھے کہ کہیں کسی ملازمت سے لگ جاؤ۔ وہ روز افزوں مسئلوں کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔ مختلف دفتروں میں درخواستیں دینے کے باوجود کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

ایک دن اس نے مانک سے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے ایک نوکری کی اشد ضرورت ہے ورنہ گھر تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائے گا۔ پلیز میرے لیے کچھ کرو۔''

''ابھی سے ذمہ داریوں کا اس قدر احساس۔'' مانک نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ ذمہ داریاں کھائے جا رہی ہیں۔''

''یہ احساس تمھیں ایک دن ضرور کامیابی دلائے گا۔'' مانک نے حوصلہ دلاتے ہوئے کہا۔

''وہ دن کب آئے گا؟'' مایا نے اداس لہجے میں کہا۔

''بہت جلد۔ کوشش جاری رکھو۔''

''تم بھی کچھ کرو پلیز۔'' مایا نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں ـــــ؟ کہو تو اپنا دل نکال کر تمھاری ہتھیلی پر رکھ دوں۔ اپنی جان تمھارے قدموں میں ڈال دوں۔''

''پلیز ــــ!'' مایا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

مانک نے ایک لمحہ توقف کیا اور کہا۔

''تمھارے لیے کچھ سوچتے ہیں۔کل سہ پہر کو ملو۔''

''کس لیے۔؟''

''میرا ایک دوست کنسٹرکشن فرم چلاتا ہے۔اس کے پاس چلیں گے۔شاید وہ اپنے یہاں تمھیں کسی کام پر رکھ لے۔''

''کیا ایسا ممکن ہے۔؟'' مایا نے بے یقینی سے کہا۔

''بھروسہ رکھو۔''

اس دن مانک کی باتوں سے مایا کو قدرے راحت ملی ــــ

گاڑی مطلوبہ جگہ پہنچ کر رک گئی۔

مانک نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور مایا سے کہا۔

''آؤ چلیں ــــ''

''یہ عمارت تو ابھی بن رہی ہے شاید۔'' مایا نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے کہا۔

''سریش ہمیں یہیں ملے گا۔یہ عمارت اسی کی نگرانی میں بن رہی ہے۔''

''لیکن یہاں کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔؟''

''آؤ ــــ اندر چلتے ہیں۔'' مانک نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

دونوں بغیر کھڑکیوں اور دروازوں والے کمروں سے گزرتے ہوئے عمارت کے وسط میں بنے ہوئے ایک وسیع ہال میں پہنچے۔چھت کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ پچھلے دو تین دنوں میں اس کی ڈھلائی ہوئی ہوگی۔

''یہ علاقہ آبادی سے کافی دوری پر ہے۔ایسی جگہ عمارت بنانے سے کوئی فائدہ؟'' مایا نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''آج کل ہر کوئی کلکتے کی بھیڑ بھاڑ والی زندگی سے دور بھاگنا چاہتا ہے۔'' مانک مسکرایا۔

''لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' مایا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

''میں تو ہوں ــــ'' مانک نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

یکا یک مایا نے اس کی آنکھوں میں وہ سب کچھ دیکھ لیا جس کی اسے کبھی توقع نہیں تھی۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے مانک۔'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکی۔

مانک اس کے جسم سے کھیلتا رہا۔مایا کی آنکھیں نم ہوتی رہیں۔اس کا دل کسی بھاری بوٹ کے تلے بار بار کچلتا رہا۔خواب بکھرتے رہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنے محسن نما دشمن کا گلا دبا دینا چاہتی تھی لیکن اس کے ہاتھ پتھر کی طرح شل ہو چکے تھے۔شاید بھروسہ ٹوٹتا ہے تو انسان ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے۔

کئی دنوں تک مایا چپ چپ رہی۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اپنی بربادی کا حال وہ کسی سے نہ کہہ سکی۔ والدین سے نہ کسی سہیلی سے۔ کہنے سے فائدہ بھی کیا۔ ذہن میں اٹھتا ہوا طوفان اندر ہی خاموش ہو جائے تو بہتر ہے مگر یہ طوفان اسے اڑا کر کہاں لے جائے گا' وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ہر لمحہ، ہر سوچ پر اس کے سینے کے ٹانکے ٹوٹتے جا رہے تھے۔ وہ جتنا سوچتی تھی اس کا سر بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ اردگرد ہیبت ناک شکلیں نظر آ رہی تھیں۔ عجیب عجیب ڈراؤنے چہرے منہ پھاڑے قہقہہ لگا رہے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے ان سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بھاگ رہی تھی۔ ہیبت ناک شکلیں اپنے ناخونی پنجے اس کی طرف بڑھا رہی تھیں۔ وہ زور زور سے چیخنا چاہ رہی تھی مگر آواز حلق کے اندر پھنس کر رہ گئی تھی۔ تیز ہوائیں' کانٹے دار جھاڑیاں، اونچی نیچی زمین اور اس کے گھبرائے ہوئے بھاگتے قدم۔ ہر شناسا چہرہ خوفناک نظر آ رہا تھا۔ وہ سب سے دور بھاگ جانا چاہ رہی تھی۔ دور' بہت دور۔ ایک ایسی جگہ جہاں سبھی اس کے لیے اجنبی ہوں۔

ایسے دردناک عالم میں سمر نے اسے سہارا دیا۔

وہ ان دنوں سرکاری ملازمت کے لیے مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے مایا کو اپنی کتابیں اور نوٹس دیے۔ وہ دھیرے دھیرے اعتدال پر آنے لگی اور قسمت کو اس پر رحم آ ہی گیا۔ مقابلہ جاتی امتحان کا نتیجہ اس کے حق میں نکلا۔

خوش قسمتی کی بات یہ بھی تھی کہ مایا اور سمر دونوں نے امتحان پاس کیے اور ایک ہی دفتر میں ملازمت سے لگ گئے۔ آج بھی مایا جب کبھی ان باتوں کو یاد کرتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے ـــــ اس کے کردار کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے آج تک ہم میں سے کسی کو مانک کا اتہ پتہ نہیں بتایا۔ ہمیں اس کے نام کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں!

نو

ایئر پورٹ پر جہاز سے باہر نکلتے ہی سردی کا احساس ہونے لگا۔

وہاں ایجنٹ کا آدمی رگھو شرما میرا منتظر تھا۔ پچھلی بار جب میں یہاں آیا تھا تو رگھو نے ہی مجھے ریسیو کیا تھا۔ انتہائی مخلص اور خوش مزاج آدمی ہے۔ اس میں ایک اچھا دوست بننے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔

اسٹیل کلر کے جیکٹ اور نیلے جینس پینٹ میں وہ وزیٹرز گیلری میں مجھے نظر آ گیا۔

ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، گورا چہرہ۔ عمر تیس پینتیس کے آس پاس۔ لمبے قد اور مضبوط کاٹھی کا وہ انسان ہے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر ہوا میں لہرایا۔

قریب پہنچا تو استقبالیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقصاں تھی۔

''ویلکم ٹو ممبئی مائی ڈیئر تجمل احمد۔'' وہ چہکا۔

''شکریہ۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

اس سے مصافحہ کرتے ہوئے میں نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔

ایئر پورٹ کا اندرونی حصہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ مسافروں کی تعداد بھی خاصی تھی۔

''کیسے ہو ــــ؟'' اس نے چہکتے ہوئے کہا۔

''بس ٹھیک ہوں۔''

''اور ماں......؟''

''وہ بھی ٹھیک ہے۔''

''تم سناؤ تمھارے بابا کیسے ہیں ــــ؟''

''اچھے ہیں مگر......''

''مگر کیا......؟''

''ادھر کئی ہفتوں سے کھانسی سے کچھ پریشان ہیں۔''

''کوئی سیریس بات نہیں ہے نا؟''

''نہیں......!'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر گویا ہوا۔

''اور کیسا ہے تمھارا کلکتہ ـــــ اب تو کولکا تا ہو گیا ہے نا؟''

میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔

''وہاں کلکتہ سے کولکا تا اور یہاں بمبئی سے ممبئی ـــــ ہے نا۔ بہرکیف تم اپنی سناؤ۔''

''ایجنٹ کے حکم اور تم جیسے دوستوں کے استقبال کے بیچ بس ٹھیک ہوں۔''

''کوئی تیسری مصروفیت نہیں ہے؟'' میں نے آنکھ دبا کر کہا۔

''فی الحال نہیں۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔'' اس نے میری اٹیچی کھینچتے ہوئے کہا۔

''نہیں ـــــ میں اس کے لیے کافی ہوں۔'' میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''دوستوں میں تکلف اچھا نہیں لگتا ـــــ'' اس نے زبردستی اٹیچی لے لی۔

''اچھی بات ہے۔ شکریہ۔ اب یہ بتاؤ کہاں چلنا ہے۔'' میں نے اس کے ہمراہ مین گیٹ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آج رات ہوٹل میں گزارلو۔'' رگھو نے کہا۔'' میں نے کمرہ بک کر دیا ہے۔ کل صبح دس بجے ملاقات ہوگی۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے لمبی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

''اپنی پرابلم ـــــ؟''

''کل کی چھٹی غارت ہوگئی یار۔''

''ویک اینڈ گزارنے کے لیے ممبئی کے ساحل برے نہیں ہیں۔'' رگھو نے مسکرا کر کہا۔

''یہاں ہوڑہ کے دوستوں کی کمپنی کہاں ملے گی ـــــ؟''

''ایک شام ہمارے ساتھ گزارلو۔ برا نہیں لگے گا۔''

باتیں کرتے کرتے ہم ایئر پورٹ سے باہر آ گئے۔ رات کا وقت اور جنوری کے آخری عشرے کی سردی مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ تلاش کرنے لگا لیکن اس سے قبل ہی رگھو نے سامنے سے آتی ہوئی ٹیکسی کو اشارہ کیا۔

ڈرائیور نے گاڑی ہمارے قریب لا کر روک دی۔

''ڈکی کھولو ـــــ سامان ہے۔'' رگھو نے اونچی آواز میں کہا۔

ڈرائیور گاڑی سے باہر نکلا اور ڈکی کھول کر میری اٹیچی اندر رکھتے ہوئے بولا۔

''کہاں جانا ہے ساب؟''

''باندرہ ـــــ ہوٹل مونیکا۔'' رگھو نے مختصر سا جواب دیا۔

میں اس دوران گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

''کانچ اوپر کرلو ـــــ'' رگھو نے میرے بازو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔''ہوا میں ٹھنڈ ہے۔''

رگھو سے میں اس سے قبل بھی مل چکا ہوں۔ اس کی طرف سے مجھے کوئی بے اطمینانی نہیں تھی۔ آدمی پسند کا ہے اور بھروسہ کے قابل بھی۔

''ہوٹل یہاں سے کتنی دور ہے؟'' میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''صرف دس منٹ کا فاصلہ ہے۔''

''کل دفتری امور سے کس وقت چھٹکارہ مل سکے گا؟''

''بہت جلد ـــــ لیکن شام تم میرے ساتھ گزاروگے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''کوئی خاص بات؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''یوں ہی ـــــ بہت دنوں بعد ہم ملے ہیں۔''

''کبھی کلکتے گئے ہو؟''

''نہیں۔ لیکن وکٹوریہ میموریل دیکھنے کی خواہش ہے۔''

''کیوں؟''

''تصویر دیکھ کر لگتا ہے کہ تاج محل کی کاپی ہے۔''

میں مسکرایا۔

''اور ایک بات ہے۔''

''وہ کیا ـــــ؟''

''سنا ہے وہ کلکتے کا مشہور لو میکنگ پلیس ہے ـــــ؟''

''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا ـــــ'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں ـــــ وہ بات نہیں ہے۔'' رگھو مسکرا کر رہ گیا۔

میں نے گاڑی کے باہر دیکھا۔ ایک طرف ساحل سے ٹکراتی موجیں اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔ دوسری طرف ہوٹلوں اور شوروم کی جگمگاتی ہوئی روشنی ممبئی کے مکمل جوان ہونے کی آگاہی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے میں اس روشنی میں کھو گیا۔ جیب میں پیسے ہوں تو دنیا کتنی حسین لگتی ہے۔ اور ممبئی جیسی خوبصورت جگہ تو مزید نکھری ہوئی نظر آتی ہے۔

دفعتاً رگھو کی آواز نے مجھے تصورات کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔

''کہاں کھو گئے؟ باہر نکلو۔'' میں نے دیکھا۔ ہم ہوٹل کے گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔

دروازہ کھول کر میں گاڑی سے نیچے اترا۔ اس دوران ڈرائیور گاڑی سے اتر کر ڈکی سے میرا سامان باہر نکال چکا تھا۔

رگھو نے اسے کرایہ ادا کیا۔

ہم ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوئے۔

استقبالیہ میز پر بیٹھی لڑکی نے ایک ادا سے مسکرا کر کہا۔

''یس پلیز!''

''مسٹر تجمل احمد فرام کولکاتا۔'' رگھو نے میری طرف اشارہ کر کے لڑکی سے کہا۔

''ویلکم ٹو ممبئی سر۔'' لڑکی کی مسکراہٹ مزید چمک اٹھی۔

''میں نے ان کے لیے کمرہ بک کرایا تھا ـــــ'' رگھو نے کہا۔

''ون منٹ پلیز سر ـــــ'' لڑکی مشینی انداز سے اپنے سامنے رکھے ہوئے رجسٹر پر جھک گئی اور پھر فوراً ہی مڑ کر اپنی پشت کی طرف آویزاں کی بورڈ سے چابی نکال کر میرے حوالے کرتی ہوئی بولی۔

''نمبر فورٹین سر...... یہاں دستخط کر دیجیے۔''

''تھینکس ـــــ'' میں نے رجسٹر پر دستخط کر کے چابی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اور سنو ـــــ'' رگھو نے مجھے مخاطب کیا۔ ''ہاتھ منہ دھو کر کمرے میں کھانا منگوا لینا۔ میں چلتا ہوں۔ کل صبح دس بجے ملاقات ہو گی۔''

''او کے ڈیئر۔ تھینک یو ویری مچ۔'' میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

رگھو ہاتھ ملا کر گڈ بائی کہتا ہوا رخصت ہو گیا۔

میں نے اٹیچی اٹھائی اور لڑکی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ سمجھ گئی۔ فوراً مسکرا کر بولی۔

''فرسٹ فلور پر دائیں سے چوتھا کمرہ نمبر فورٹین ہے۔ اٹیچی اپنے پیچھے کھڑے روم سرونٹ کو دے دیجیے۔''

''شکریہ ـــــ'' میں اس کی ذہانت پر مسکرا اٹھا اور اٹیچی روم سرونٹ کے حوالے کر کے اس کے پیچھے پیچھے مطلوبہ کمرے کی طرف چل پڑا!

دس

کھانا کھا کر سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو ذہن میں رگھو شرما سے پچھلی ملاقات کے مناظر تازہ ہو گئے۔

غالباً چار مہینے قبل دفتر کے کام کے سلسلے میں مجھے ممبئی آنا پڑا تھا۔ رگھو نے مجھے ایر پورٹ پر ریسیو کیا اور ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے اس نے اپنے متعلق ڈھیر ساری باتیں بتائی تھیں۔

ممبئی کے کسی اوسط درجے کے علاقے میں وہ ایک کھولی میں اپنے بوڑھے بابا کے ساتھ رہتا تھا۔ ماں بچپن میں گزر گئی تھی۔ بابا نے دوسری شادی نہیں کی اور رگھو کی پرورش و پرداخت میں بقیہ عمر گزار دی، اب رگھو کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا۔ بابا کی صحت اور ان کی خوشی کو قائم رکھنا۔ وہ ان کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو فلمی انداز میں 'بیٹا نمبر وَن' کہہ کر سینہ پھلانا اور مسکرانا اس کی عادت تھی۔ دیوانند اور کیفی اعظمی کا دیوانہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ :

''ہیرو ہو تو دیوانند جیسا۔ پورے انڈیا میں اس کے جیسا ایور گرین ہیرو نہیں ملے گا۔ کیا ایکٹنگ، کیا اسٹائل، کیا ڈائیلاگ، باپ رے باپ!''

رگھو کو دیوانند کی فلموں کے بے شمار گانے یاد تھے۔ کالا پانی، گائیڈ اور جانی میرا نام کے بیشتر مکالمے بھی اسے ازبر تھے۔

''دیوانند تک تو بات ٹھیک ہے لیکن کیفی اعظمی......؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اپنے پڑوس کے ہیں نا ـــــ''

''کیا مطلب ـــــ؟''

''ہم لوگ اور کیفی جی یو پی سے ہیں۔ اعظم گڑھ میں ہمارا گھر کیفی صاحب کے گاؤں کے پاس میں تھا۔ بابا کہتے ہیں کہ کیفی صاحب پورے انڈیا کے ٹاپ کے شاعر ہیں۔''

''تم نے ان کا آبائی مکان دیکھا ہے؟''

''نہیں یار! اپنے کو وہاں جانے کا ٹائم ہی کہاں ملا۔ بچپن میں ماں باپ کے ساتھ یہاں آیا تو بس یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ رشتے داروں نے کچھ ایسی تکلیف پہنچائی تھی کہ بابا نے پلٹ کر گاؤں کی طرف نہیں دیکھا ـــــ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ آخر تو کیفی صاحب اپنے پڑوس کے ہی

شاعر ہوئے نا ـــــ" وہ اپنی بات منوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہا تھا۔

"شبانہ اعظمی کہاں پیدا ہوئی تھیں ـــــ؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"یہ اپنے کو معلوم نہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو بڑے باپ کی بیٹی ثابت کر دیا۔"

"تم نے تعلیم کہاں تک حاصل کی؟" میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"کہاں یار ـــــ بارہ کلاس تک گیا اور بس ـــــ"

"آگے کیوں نہیں گئے؟"

"بابا جس کپڑا مل میں کام کرتے تھے' وہ اچانک بند ہوگئی۔ اور اس طرح اپنی پڑھائی بھی۔" وہ مایوسی سے مسکرایا۔

"تمھیں اس کا افسوس ضرور ہوا ہوگا؟"

"ہاں ہوا تھا۔" اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھ سے زیادہ بابا کو دکھ ہوا تھا۔ کئی مہینوں تک انھیں اس بات کا صدمہ رہا کہ ان کی وجہ سے میری پڑھائی رک گئی۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ ان کی صحت اور خوشی ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔ وہ خوش رہیں، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ یہ سن کر انھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اس دن بابا مسکرا رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔"

رگھو تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔

"اب بابا کیسے ہیں ـــــ؟"

"اچھے ہیں۔ لیکن آج بھی جب کبھی وہ دن یاد آتے ہیں' تو اداس ہو جاتے ہیں۔ خیر' تم سناؤ۔ تمھارے گھر میں کون کون لوگ ہیں۔" اس نے قصداً رُخ میری طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"میں اور ماں ـــــ"

"اور کوئی نہیں ـــــ؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"چلو اچھا ہوا ـــــ تمھاری ماں ہے۔ خوش نصیب ہو۔" کہتے کہتے وہ اداس ہوگیا۔

"تمھیں ماں کی یاد آتی ہے ـــــ؟"

" آتی ہے لیکن بہت کم۔ بابا نے ماں کی کمی محسوس ہی نہیں ہونے دی۔ گھر میں ماں کی ایک بڑی سی تصویر ہے۔ دل گھبراتا ہے تو دیکھ لیتا ہوں۔ کیا ہے کہ ماں کیسی ہوتی ہے میں نے جانا ہی نہیں۔ آٹھ سال کا تھا کہ وہ ٹی بی کا شکار ہوئی اور چل بسی۔"

تھوڑی دیر تک ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ پھر میں نے پوچھ لیا۔

"ٹی بی تو ایسی خطرناک بیماری نہیں ہے کہ......"

"غریبی سب سے خطرناک بیماری ہے یار۔" اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "ایک طرف تو کپڑا مل کا معمولی ورکر اور دوسری طرف ٹی بی جیسی بیماری۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ماں کو کسی پہاڑی جگہ پر لے جائیں۔ بابا کے لیے یہ کہاں پوسیبل تھا۔ اصل میں غلطی ماں کی تھی۔ اس نے بابا کو

بیماری کے بارے میں کبھی بتایا نہیں ۔معمولی کھانسی کا بہانہ کر کے ٹالتی رہی ۔آخری اسٹیج میں جب بابا کو معلوم ہوا تو معاملہ بہت بگڑ چکا تھا ۔"

رگھو سے تین دنوں کی ملاقات کے بعد مجھے ایسا لگا کہ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں ۔وہ مجھے ایک کھلی کتاب کی طرح نظر آیا۔

ممبئی جیسی جگہ ـــــ جہاں کچھ عرصہ پہلے بعض لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے' گھروں کو نذرِ آتش کر رہے تھے' مذہب کے نام پر شیطانی رقص کر رہے تھے' دونوں فرقوں کے لوگوں کے دلوں میں نفرت ہی نفرت ابل رہی تھی' بچے' بوڑھے' مرد' عورت' غریب' امیر سب کے سب پناہ مانگ رہے تھے' بیشتر لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر اشک بار آنکھوں اور ہارے ہوئے قدموں سے دوسری ریاستوں کی طرف رُخ کر رہے تھے' آگ اور دھوئیں سے لپٹی ہوئی فضا سے نکل کر جائے امان تلاش کر رہے تھے ـــــ ایسی جگہ پر رگھو جیسے انسان کو پا کر مجھے خوشی ہو رہی تھی اور انسانیت پر میرا ایمان مزید پختہ ہوتا جا رہا تھا۔

وہاں سے واپسی کے دن اس نے مجھے گلے سے لگا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"یار تم سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی ۔تین دن کیسے گزر گئے' پتہ ہی نہیں چلا ۔"

میں نے بھی اس سے بغل گیر ہوتے وقت مسکرا کر اس کی بات دہرائی ۔

"معلوم نہیں اب تمھارا یہاں آنا کب ہو ـــــ ؟" اس نے اداس لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے دفتر کے سلسلے میں جلد ہی دوبارہ آنا پڑے ۔"

"آئندہ آنا تو ماں کو ساتھ لانا ـــــ" نہ جانے کس خیال کے تحت وہ بول پڑا۔

"ماں کو ـــــ ؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ـــــ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟"

"اس کا گھر سے باہر نکلنا ہی بہت مشکل ہے ۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ان کی تصویر ہی لیتے آنا ـــــ"

میں اس کے چہرے پر نظریں جمائے سوچتا رہا ـــــ انسانی جذبے کسی بھی دھرم اور مذہب سے بالاتر ہوتے ہیں ۔انسان سرحدیں بناتا ہے' ملک کی' مذہب کی' زبان کی ـــــ پھر ان سرحدوں کے درمیان مزید لاتعداد سرحدیں قائم ہوتی ہیں ۔انسان منقسم ہوتے رہتے ہیں ۔لباس، غذا، رہن سہن، رسم و رواج ـــــ الغرض انسان نے اپنے ارد گرد اس قدر بے شمار سرحدیں قائم کر لی ہیں کہ ان سے نکلنا کارے دارد ۔لیکن انسانی جذبہ ان سرحدوں کو پل بھر میں منہدم کر دیتا ہے ۔اور تب ایک انوکھی خوشی اور ایک لطیف کیفیت سے سرشاری کا احساس ہوتا ہے ۔

"کس خیال میں کھو گئے ـــــ ؟"

"کچھ نہیں ـــــ" میں مسکرایا۔

"پسنجرز کی لاسٹ کال ہو چکی ہے ۔" اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے مصافحہ کی بجائے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"تمھارے ساتھ گزرا ہوا وقت مجھے یاد رہے گا۔"

”مجھے بھی —— “وہ مسکرایا۔

”دفتر کا ٹور بھی اس قدر پر کیف ہو سکتا ہے مجھے معلوم نہ تھا۔“

”تمھیں اپنی کمپنی پسند آئی۔ہمارے لیے یہی کمپلی منٹ بہت ہے۔گڈ بائی اینڈ گڈ لک۔“

”تھینک یو اینڈ گڈ بائی —— “ کہتے ہوئے میں نے اپنی اٹیچی اٹھائی اور ایرو ڈرم کی طرف چل پڑا!

گیارہ

دن کے دس بجنے والے تھے۔

میں نے ناشتے سے فارغ ہو کر سگریٹ سلگایا اور سامنے کی کھڑکی کے پردے ہٹا دیے۔

باہر پھیلا ہوا سمندر اور اس کے اوپر کھلے آسمان کا منظر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مزید برآں موسم کی خنکی سے لطف دو بالا ہو رہا تھا۔ چاروں طرف سہانی دھوپ کھلی ہوئی تھی۔

میں نے گہری سانس لی اور بستر کی طرف مڑا، جس پر آج کا اخبار پھیلا ہوا تھا۔

جلدی جلدی سرخیاں دیکھنے لگا۔ کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ وہی روزانہ کی اوٹ پٹانگ خبریں، پارلیمنٹ کی کارروائی ٹھپ، وزیر گھپلے میں ملوث، کم سن کی عصمت دری، ڈھونگی بابا گرفتار وغیرہ وغیرہ۔

دفعتاً دراز ے پر دستک ہوئی۔

میں سمجھ گیا۔ رگھو ہو گا۔

"آجاؤ ــــ" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

"گڈ مارننگ شجیل ڈیئر۔" حسب توقع رگھو چہکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "کہو۔ کیسے ہو؟"

میں نے اخبار سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ سفید شرٹ اور ایش کلر کی پتلون میں وہ کافی ہینڈسم دکھائی دے رہا تھا۔

"گڈ مارننگ اینڈ ویل تھینکس۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہوپ یو آر او کے؟"

"یس۔ آف کورس۔"

"رات کیسی گزری؟ کوئی پریشانی نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں ــــ"

''گڈ ـــــ دفتر چلیں۔''

''دومنٹ ٹھہرو۔'' میں نے جلدی سے اپنا بریف کیس کھولا ۔ چیف کے دیے ہوئے لفافے سے کاغذات نکال کر ان پر ایک نظر ڈالی۔ دوبارہ انھیں لفافے میں رکھ کر بریف کیس بند کیا اور اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے کہا۔

''چلو ـــــ بائی دی وے چائے پیو گے؟''

''یہاں نہیں ـــــ دفتر پہنچ کر کافی پئیں گے۔''

''یہاں سے دفتر کا فاصلہ کتنے منٹ کا ہے؟'' میں نے کمرہ لاک کرتے ہوئے کہا۔

''بیس منٹ لگیں گے۔''

''یعنی پہنچتے پہنچتے ساڑھے دس بجیں گے۔'' میں نے کلائی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

رگھو کوئی جواب دینے کی بجائے مسکرا کر رہ گیا۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے ہم ایجنٹ کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ویل ڈیکوریٹیڈ روم۔ ایک طرف قرینے سے الماری میں رکھی ہوئی فائلیں شیشے کی دیواروں سے جھانک رہی تھیں۔ دوسری طرف کھلی ہوئی کھڑکی سے سمندر کی اٹھلاتی موجیں نظر آ رہی تھیں۔ نصف بیضاوی شکل کی چوبی میز کے سامنے خوبصورت کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف درمیان میں ایک بڑی کرسی پر ایجنٹ دراز تھے۔ ان کے عقب میں کمپیوٹر رکھا ہوا تھا اور اس کے بالکل اوپر دیوار پر چسپاں سوئزرلینڈ کی برف سے ڈھکی ہوئی وادی کی تصویر دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔

ایجنٹ نے کھڑے ہو کر ہمارا استقبال کیا۔

''ویلکم مسٹر شجیل۔ تشریف رکھیے۔''

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ہاتھ ملایا اور ان کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ رگھو میرے بازو میں کھڑا رہا۔

''کیا لیں گے ـــــ چائے یا کافی؟'' ایجنٹ نے مجھ پر نظریں ڈالتے ہوئے رگھو کی طرف دیکھا۔

''سر ـــــ کافی کے لیے میں نے آرڈر دے دیا ہے۔'' اس نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''ویری گڈ۔ ناؤ ٹیک یور سیٹ کمفرٹیبلی۔''

ایجنٹ کی اجازت ملتے ہی رگھو میرے بازو والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''جی نہیں ـــــ شکریہ۔''

''ہم کام کی بات شروع کریں؟'' ایجنٹ نے دراز سے ایک نیلے رنگ کی فائل نکال کر سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جی بالکل ـــــ'' میں نے بریف کیس سے لفافہ نکالا۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔

ایجنٹ نے رگھو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''سر ـــــ کافی۔''رگھو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس دوران دفتر کا چپراسی ٹرے میں کافی لے کر کمرے میں داخل ہوا۔

''اچھی بات ہے۔لیجیے مسٹر شجیل۔''ایجنٹ نے کافی کا پیالہ میری طرف بڑھا دیا۔

''جی شکریہ ـــــ!''

مختصر سے وقفے کے بعد ہم نے اصل کام شروع کر دیا۔غیر ممالک میں ملازمت کے لیے جانے والے تیس امیدواروں کی فہرست پر نظر ڈالی۔ان کی تفصیلات اور دیگر ضروری باتوں پر غور و فکر کرتے کرتے سہ پہر کے تین بج گئے۔ایجنٹ کی ہدایت پا کر رگھو نے دفتر میں کھانے کے پیکٹ منگوا لیے۔کام سے فراغت ملتے ملتے ساڑھے تین بج گئے۔

ایجنٹ نے مجھے رخصت کرتے وقت اطمینان و مسرت کا اظہار کیا۔

دفتر سے نکل کر میں نے سب سے پہلے موبائل پر اپنے چیف سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ادھر سے لائن ملتے ہی انھیں مختصراً ایجنٹ سے میٹنگ کی روداد بتا دی۔ساتھ میں یہ بھی بتا دیا کہ بینک ڈرافٹ تصحیح کے بعد سوموار سے پہلے ملنا مشکل ہے۔اُدھر سے چیف نے پوری رپورٹ سننے کے بعد مجھے ایک دن مزید رکنے کی اجازت دے دی۔میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

رگھو میرے چہرے کے تاثرات سے سب کچھ بھانپ گیا۔مسکرا کر زوردار نعرہ لگایا۔''آج کی شام ـــــ تمھارے نام!''

میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔

واقعی وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔مجھے معلوم تھا اس کی کمپنی میں بوریت نہیں ہوگی۔

میں نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھا اور رگھو کے ساتھ دفتر کی سیڑھیوں سے اترنے لگا!

بارہ

''تم مسلمان ہو ـــــ؟'' رگھو نے گیٹ وے آف انڈیا کے قریب کبوتروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ـــــ لیکن اچانک یہ سوال کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''شادی ہو چکی ہے؟'' جواب دینے کی بجائے اس نے دوسرا سوال جڑ دیا۔

''اب تک تو نہیں ہوئی ـــــ لیکن کیوں؟''

میں نے محسوس کیا کہ وہ میری حیرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی اپنے آپ کو اس کے سوالوں کے حوالے کر دیا۔

''وہاں کلکتے میں کتنا کما لیتے ہو؟'' اس نے پھر سوال داغا۔

''پلیز ـــــ عورتوں سے عمر اور مردوں سے تنخواہ نہیں پوچھتے۔''

رگھو نے مسکرا کر کہا۔

''آؤ۔ تمھیں شجاع سے ملاتا ہوں۔''

''کون شجاع ـــــ؟''

''تم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہو وہ اس کا مالک ہے۔''

''مجھے اس سے کیا کام؟''

''اس لیے کہ وہ بھی تمھاری طرح مسلمان ہے۔'' رگھو نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

''تمھاری پہیلیوں کا یہ سلسلہ بہت دلچسپ ہے؟'' میں نے حیران ہونے کی بجائے لطف لیتے ہوئے کہا۔

رگھو یکایک خاموش ہو گیا جیسے اسے میری طرف سے کسی ایسے ردعمل کی ہرگز امید نہیں تھی۔ میں نے قدرے توقف کے بعد مسکرا کر کہا۔

''اچھا ـــــ آگے بولو۔''

اس نے تھوڑی دیر تک اپنے آپ کو تیار کیا۔ پھر کہنا شروع کیا۔

''شجاع تمہاری طرح ایک دفتر میں کام کرتا تھا۔میری اس سے گاڑھی چھنتی تھی ـــــ اب بھی جب کبھی وہ ممبئی آتا ہے تو مجھ سے ضرور ملتا ہے۔''

''مطلب وہ یہاں نہیں رہتا۔؟''

''ریاض کے قریب نجران نام کی ایک جگہ ہے ۔وہاں اسے ایک معمولی ملازم کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔آج وہ ممبئی جیسے شہر میں ایک خوبصورت ہوٹل کا مالک ہے۔''رگھو نے اپنی بات مکمل کر کے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ سب کیسے ممکن ہوا؟''میرا تجسس بڑھا۔

''اس لیے کہ وہ تمہاری ذات والا ہے۔''رگھو حسبِ معمول مسکرایا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''آؤ۔اسی سے پوچھتے ہیں ۔دلچسپ آدمی ہے۔اس کے ساتھ اچھا وقت گزرے گا۔''

''وہ تو تمہارے ساتھ بھی اچھا گزر رہا ہے۔''میں نے کہا اور آس پاس چہل قدمی کرتے ہوئے خوبصورت جوڑوں کو دیکھنے لگا۔سورج غروب ہو چکا تھا۔سمندر کی لہریں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ابھی چاروں طرف اجالے کی حکمرانی تھی لیکن بعض عمارتوں اور دکانوں میں بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ہوا کی خنکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

رگھو نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور میری طرف پیکٹ بڑھا دیا۔

''ابھی نہیں ـــــ''میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''پہلے کسی ریستوراں میں کافی پیتے ہیں۔''

''اس کے بعد؟''

''تمہارے دوست شجاع سے ملتے ہیں۔''

''آؤ۔پہلے اسی کے یہاں چلتے ہیں۔وہیں کافی پی لیں گے۔عالیہ بھابھی کافی بہت اچھا بناتی ہیں۔''رگھو نے میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

میں نے کلائی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''تمہارا بار بار گھڑی دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔''رگھو نے منہ بنا کر کہا۔

''کیوں بھئی ـــــ؟''

''تم نے سنا نہیں۔اس سلسلے میں شاعر نے کیا کہا ہے؟''

''کیا کہا ہے؟''میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

رفیقوں سے بوقتِ گفتگو یہ دھیان تم رکھنا
کلائی کی گھڑی بھولے سے بھی دیکھا نہیں کرتے

میں مسکرایا۔لیکن رگھو قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''اس میں قہقہہ لگانے کی کیا بات ہے؟''

''کیوں، شعر اچھا نہیں لگا ــــ؟''

''اچھا ہے۔لیکن تمہارا قہقہہ دیکھ کر لگتا ہے کہ تم نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔''

''شعر سن کر قہقہہ نہیں لگانا چاہیے۔؟''

''کیوں نہیں۔لیکن سوال ہے کہ تب لطیفہ سن کر کیا کرنا چاہیے۔؟''

''سر پیٹنا چاہیے۔''رگھو نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''تمھیں بہت جلد غصہ آ گیا۔''

رگھو نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔''مجھے غصہ دلانا بہت مشکل ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ یہ بہت آسان ہے۔''میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''بہت مشکل ہے۔''وہ مسکرایا۔

''بہت آسان ہے۔''میں نے تاؤ دلاتے ہوئے کہا۔

''بہت مشکل ہے۔''اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں کہتا ہوں بہت آسان ہے۔''

''میں کہتا ہوں بہت مشکل ہے۔''وہ تقریباً چیخ پڑا۔

میں یکا یک خاموش ہو گیا۔

فوراً اسے اپنی حالت کا اندازہ ہو گیا اور تب ٹھہا کے مار کر ہنس پڑا۔

''تم بہت خطرناک آدمی ہو شجیل۔''اس نے شہادت کی انگلی دکھاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''تمھاری صحبت کا اثر ہو رہا ہے۔''میں نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے اسے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''پھر وہی بات۔''

''اچھا میرے بھائی۔تمام شام یہیں گزارنا ہے یا اپنے دوست شجاع کے یہاں چلنا ہے؟''

رگھو نے توقف کیا۔کچھ سوچ کر کہا۔

''آؤ چلتے ہیں۔لیکن تم وہاں شروع نہ ہو جانا۔''

''او کے۔او کے۔''میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

رگھو کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔اس نے آگے بڑھ کر گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو ہاتھ دکھایا اور ہم اس میں سوار ہو کر شجاع کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے!

تیرہ

ہم شام کے سات بجے شجاع کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔سجا سجایا کمرہ تھا۔دیواروں پرخوبصورت پینٹنگ۔کھڑکی کے پردے خوشبو میں بسے ہوئے۔فرش پرنفیس قسم کا قالین۔ایک گوشے میں رنگین ٹی وی اورمیوزک سیٹ۔دوسری طرف الماری میں سجی ہوئی کتابیں اور درمیان میں قرینے سے بچھے ہوئے صوفے سے مالک مِکان کے مزاج کی نفاست کا علم ہو رہا تھا۔

شجاع نے بڑی گرم جوشی سے ہمارااستقبال کیا۔

وہ گورے رنگ، لمبے قد اور مضبوط کاٹھی کاانسان لگ رہا تھا۔چہرہ ریش وبروت سے پاک تھا۔عمر پینتیس چھتیس کی ہوگی۔سر کے بال لمبے اور سیاہ تھے۔کریم کلر کی قمیص اورسفید پاجامے میں اس کی شخصیت جاذبِ نظر معلوم ہو رہی تھی۔

اس نے بڑھ کرمصافحہ کیااوراپنا تعارف خود کراتے ہوئے کہا :

''خاکسارکواحمد شجاع کہتے ہیں اور یہ ہماری بیگم عالیہ شجاع۔''

''اور یہ ہیں مسٹر شجیل احمد فرام کولکاتا۔''رگھو نے چہکتے ہوئے کہا۔

میں نے انھیں آداب کہا۔

عالیہ خوبصورت ناک نقشے والی خاتون نظرآئی۔گلابی شلوارقمیص میں وہ کافی حسین لگ رہی تھی۔

ان لوگوں سے مل کرمجھے واقعی رشک آنے لگا۔

رسمی گفتگو کے بعد میں نے شجاع سے اس کی ترقی کے بارے میں پوچھا۔

''پرانی کہاوت آپ نے سنی ہوگی کہ ہر ترقی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔''اس نے عالیہ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ شرما کراٹھتی ہوئی بولی۔

''میں چائے لاتی ہوں۔''

''بھابھی،چائے کے ساتھ وائے بھی ـــــ ''رگھو نے حسبِ عادت مسکرا کرکہا۔

میں نے اسے آنکھ دکھائی۔

اس نے ہاتھ اٹھا کرکہا۔''گھبراؤ نہیں۔میں نہ بھی کہوں تو بھابھی ہمیں صرف چائے پر ٹرخانے والی نہیں ہیں۔''

''تم نہیں سدھرو گے۔''میں نے لاچاری سے کہا۔

عالیہ مسکراتے ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں نے دیکھا۔شجاع اور رگھو بھی مسکرا رہے تھے۔غیر ارادی طور پر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔

''دیٹس لائیک اے گڈ بوائے۔''رگھو نے بزرگانہ لہجے میں کہا۔

چند لمحوں بعد میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور شجاع کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہا تھا۔غالباً کہانی کا ابتدائی سرا تلاش کر رہا ہو۔رگھو نے بڑھ کر سامنے رکھی ہوئی میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور لائٹر کی جستجو میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''پہلے چائے اس کے بعد سگریٹ۔''یہ عالیہ کی آواز تھی جو چائے کی موونگ میز کو دھکا دیتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

قریب پہنچ کر اس نے ناشتے کی طشتری ہماری طرف بڑھا دی اور خود سلیقے سے چائے بنانے لگی۔

اسنیکس کے بعد ہم نے چائے کا پیالہ ہونٹوں سے لگایا۔

عالیہ اجازت لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

شجاع نے اپنی چائے ختم کی۔کھانس کر گلا صاف کیا اور کہانی یوں شروع کی۔

''دس سال پہلے کی بات ہے۔عالیہ سے میری پہلی ملاقات نجران میں ہوئی تھی۔میرے کفیل نے عالیہ کے والد کی دکان پر مجھے لگوا دیا تھا۔یہ اسٹیشنری کی ایک بڑی دکان تھی۔عبدالواحد بڑے نیک اور مخلص انسان تھے۔ان کی بیگم بھی انتہائی شریف خاتون تھیں۔گذشتہ سال دونوں میاں بیوی یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔واحد صاحب مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔میری ایمانداری اور محنت سے بہت خوش رہا کرتے تھے۔کبھی کبھی تو خوشی میں یہاں تک کہہ دیتے کہ خدا نے دنیا میں مجھے ان کا بیٹا بنا کر بھیجا تھا۔مگر غلطی سے میں نجران کی بجائے انڈیا میں پیدا ہو گیا۔قسمت کو ملانا منظور تھا اس لیے میرے کفیل نے ملا دیا۔''

شجاع نے رک کر سگریٹ سلگایا اور دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''میری ڈیوٹی دکان پر تھی۔کبھی کبھی ان کے کسی ذاتی کام سے ان کے گھر بھی جانا پڑتا۔شروع میں عالیہ مجھ سے پردہ کرتی تھی لیکن ایک سانحے نے ہمارے درمیان سے یہ پردہ اٹھا دیا ـــــ''

''کون سا سانحہ؟''میں نے چائے ختم کر کے پیالہ طشتری میں رکھتے ہوئے کہا۔

''بتاتا ہوں۔''شجاع مجھے متجسس دیکھ کر مسکرایا اور ایک نظر رگھو پر ڈالتے ہوئے کہا''واقعہ یوں ہے کہ مئی کا مہینہ تھا اور دوپہر کا وقت۔واحد صاحب کیش کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھے۔میں اپنے کاؤنٹر پر کسی خریدار کو نپٹانے میں لگا ہوا تھا۔دکان کے دوسرے ملازمین بھی اپنی اپنی جگہ کام پر لگے ہوئے تھے۔ابھی لنچ بریک ہونے میں دیر تھی۔دفعتاً دھڑام کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔سر اٹھا کر دیکھا۔کیش کاؤنٹر کے شیشے کے پیچھے واحد صاحب کا چہرہ نظر نہیں آیا۔بازو والے کاؤنٹر کے ملازمین اس طرف دوڑ پڑے۔واحد صاحب گر گئے۔کسی نے چیخ کر کہا۔

میں اچھل پڑا۔بھاگ کر کاؤنٹر کی طرف گیا۔دیکھا۔واحد صاحب کرسی سے نیچے گر پڑے تھے۔

’’کوئی پانی لاؤ۔‘‘ میں گھبرا کر چلایا۔

میرا رفیق کار ساجد فوراً دوڑ کر پانی کی بوتل لے آیا۔ جلدی جلدی واحد صاحب کے چہرے پر چھڑکاؤ کیا گیا۔ چشم زدن میں تمام ملازمین جمع ہو گئے۔

’’ڈاکٹر صاحب کو فون کرو۔‘‘ میں نے ساجد سے کہا۔

’’نہیں ــــ نہیں ــــ میں ٹھیک ہوں۔‘‘ واحد صاحب نے آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے کہا۔

’’اللہ کا کرم ہے۔‘‘ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ’’لیکن یہ سب ہوا کیسے؟‘‘

’’سر میں ذرا سا چکر آ گیا تھا۔‘‘ انھوں نے کرسی پر بیٹھ کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

’’بہتر ہو گا کہ آپ گھر پر چل کر آرام کر لیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کو وہیں بلا لیتا ہوں۔‘‘

’’اس کی کوئی ضرورت نہیں۔‘‘ انھوں نے آہستہ سے کہا۔

’’معاف کیجئے۔ میں آپ کا یہ حکم ماننے سے قاصر ہوں۔‘‘ جیب سے موبائل نکال کر میں نے ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کیا اور واحد صاحب کی علالت کی مختصر اًر پورٹ دیتے ہوئے ان سے گھر پر آنے کی گزارش کی۔

واحد صاحب میری گھبراہٹ دیکھ کر آہستہ سے مسکرائے۔ ان کے چہرے پر پدرانہ شفقت کا جذبہ صاف نمایاں تھا۔

’’میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔‘‘

’’جی ــــ بالکل درست فرمایا۔ لیکن اس وقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے میں نے ڈرائیور سے گاڑی لانے کو کہا۔

چند ثانیوں میں وہ آ گیا۔

میں نے واحد صاحب کو گاڑی میں بٹھایا۔ ساجد کو دکان کے سلسلے میں جلدی جلدی کچھ ہدایتیں دیں اور ڈرائیور سے گھر کی طرف چلنے کو کہا۔

تھوڑی دیر میں ہم ان کے مکان کے سامنے تھے۔

گاڑی کا دروازہ کھول کر میں نے واحد صاحب کو سہارا دیتے ہوئے باہر نکالا۔

مکان کی بالکونی میں کھڑی عالیہ کی امی کی نظر ہم پر پڑی۔

’’ان سے کچھ نہ کہنا۔‘‘ واحد صاحب نے مجھے آہستہ سے کہا۔ ’’خواہ مخواہ گھبرا جائیں گی۔‘‘

اس دوران تیزی سے بھاگتی ہوئی عالیہ کی امی دروازے پر آ کر چلائیں۔

’’کیا ہوا انھیں؟ خیریت ہے نا؟‘‘

’’کچھ نہیں ــــ بس ذرا سا......‘‘ واحد صاحب نے نقاہت سے کہا۔

’’سر میں چکر آ گیا تھا۔ دکان میں بیٹھے بیٹھے اچانک گر پڑے۔‘‘ میں نے جلدی جلدی کہا اور انھیں سہارا دیتے ہوئے اندر کے کمرے میں پہنچا۔

’’کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟‘‘ بدحواسی میں عالیہ جھٹکے سے کمرے میں داخل ہوئی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی ایک لمحہ کے لیے جھجک گئی۔

’’گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ دکان سے ڈاکٹر صاحب کو فون کر دیا ہے۔ وہ آتے ہوں گے۔‘‘ میں نے رک رک کر کہا!

چودہ

چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد شجاع نے کہنا شروع کیا۔

''واحد صاحب ایک ہفتہ دکان نہیں آئے۔ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق انھیں گھر پر آرام کرنا تھا۔دکان کی ساری ذمے داریاں میرے سر آ گئیں۔روزانہ کی خرید وفروخت اور اسٹاک رجسٹر کی نگرانی کے فرائض مجھے ادا کرنے پڑے۔ان امور کے علاوہ ہر شام دکان بند کرنے کے بعد واحد صاحب کے مکان پر حاضر ہوتا رہا اور انھیں حساب کتاب سے واقف کراتا رہا۔

روزانہ کی اِن مصروفیات میں میری ایک غرض بھی شامل ہوگئی۔ہر شام واحد صاحب کے مکان پر پہنچ کر یہی کوشش کرتا کہ کسی طرح عالیہ کا خوبصورت چہرہ نظر آجائے۔وقت کا پرندہ حالات کی فضا میں اُڑتا رہا۔میں نے محسوس کیا کہ واحد صاحب کے ساتھ ساتھ ان کی اہلیہ بھی مجھے عزیز رکھنے لگی ہیں۔رفتہ رفتہ میں ان لوگوں کے قریب تر ہوتا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب قدرت مجھ پر کچھ زیادہ مہربان ہوئی۔میں عالیہ کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔

''اس کے بعد کیا ہوا ــــــ؟''شجاع کو خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔

''گاڑی تیزی سے پٹری پر دوڑنے لگی۔''رگھو نے مسکرا کر کہا۔

میں نے دیکھا۔شجاع کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔اس نے میرا تجسس دیکھ کر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا۔

''ان تمام باتوں کے سبب کچھ منفی اثرات بھی نمایاں ہوئے۔''

''منفی اثرات؟ ــــــ وہ کیوں؟''میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''واحد صاحب اور ان کے گھر والوں سے میری قربت دکان کے دیگر اسٹاف کی نظروں میں کھٹکنے لگی۔کسی کو مجھ پر رشک آنے لگا۔کوئی حسد کی آگ میں جلنے لگا۔''

''عجیب وغریب صورتِ حال پیدا ہوگئی ہوگی؟''میں نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا۔

''صرف عجیب وغریب نہیں بلکہ تکلیف دہ بھی۔کبھی مجھے انڈین کہہ کر حقارت کی نظروں سے دیکھا جاتا۔موقع در موقع مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی۔کبھی دل پر جبر کرکے سب کچھ پی جاتا۔کبھی ابل پڑتا۔عالیہ کی تھوڑی دیر کی قربت میں یہ سب کچھ ہوا ہو جاتا۔عام طور پر ہر جمعے

کی شام کو واحد صاحب کے مکان پر خصوصی اہتمام ہوتا اور اس میں مجھے حاضر ہونا پڑتا۔ یہ ان کا حکم تھا۔ شام کی چائے اور رات کا کھانا انھیں کے ساتھ ہوتا۔ پلاؤ اور مٹن قورمہ واحد صاحب شوق سے کھاتے اور مجھے بھی کھلاتے۔ کھانا اس قدر لذیذ ہوتا تھا کہ اب کیا بتاؤں۔ ایسا لگتا تھا کہ عالیہ کی امی کے ہاتھوں میں جادو ہے۔ سلیقے سے گفتگو کرتیں اور سلیقے سے کھانا بھی پکاتی تھیں۔

انھیں دنوں کی بات ہے۔ واحد صاحب سے دورانِ گفتگو علم ہوا کہ وہ بنیادی طور پر انڈین ہیں۔ اتر پردیش کے ضلع بلند شہر میں ان کا آبائی مکان تھا، جواب غالباً ان کے رشتہ داروں کے قبضے میں تھا۔ اوائل عمری میں والدین گزر گئے۔ تلاشِ معاش میں گھر چھوڑنا پڑا۔ دورِ جدو جہد میں در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ اور آخر کار وطن سے دور نجران میں آ کر ٹھکانہ ملا۔ ابتدا میں دو ایک مرتبہ انڈیا آئے لیکن بعد ازاں اپنے بعض رشتہ داروں کے کھوکھلے جذبوں کے سبب وہ نجران کے ہو کر رہ گئے۔

ایک دن میں نے عالیہ کو مکان پر تنہا پایا۔ حسبِ معمول جمعہ کی شام تھی۔ میں وہاں چائے کے وقت حاضر ہوا تھا۔ عالیہ سے معلوم ہوا کہ والدین روٹین چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے مطب گئے ہوئے ہیں۔ جلد ہی لوٹیں گے۔

اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

یہ چھوٹا سا مگر کشادہ اور قرینے سے سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا۔

چند لمحوں میں عالیہ چائے لے کر آ گئی۔

میں نے رسمی گفتگو کے بعد از راہِ مذاق پوچھ لیا۔

''ایک بات کہوں؟''

اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اِنڈیا کی چیز کبھی انڈیا واپس جائے گی؟''

''میں سمجھی نہیں ـــــ''

میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے اپنا سوال دہرایا۔

''زیادہ شرارت اچھی نہیں ـــــ'' اس نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''شرارت نہیں ـــــ اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہا ہوں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو بیٹھو۔'' میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ''دورانِ گفتگو یوں اٹھ جانا اچھی بات نہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ـــــ اگر حالات اجازت دیں تو ـــــ؟''

''اول یہ کہ میں انڈین نہیں ہوں۔'' اس نے کرسی پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''والد صاحب ہوتے ہوں گے ـــــ اب وہ بھی ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو چکے ہیں۔ اس لیے آپ کا سوال بالکل بے بنیاد ہے۔'' اس نے مسکرا کر اپنی بات ختم کی۔

''کبھی وہاں جانے کی خواہش نہیں ہوتی؟'' میں نے مزید کریدا۔

''بالکل نہیں ۔''اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''والدین کے ساتھ؟''

''جی نہیں ـــــ''

''میرے ساتھ بھی نہیں ـــــ''میں نے آنکھ دبا کر کہا۔

''کیوں ۔آپ کے ساتھ وہاں جانے میں کیا خاص بات ہے؟''اس نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''خاص بات ہے۔''میں نے زور دے کر کہا۔

''مجھے ایسا نہیں لگتا ـــــ''

''بہر کیف ـــــ اس بات سے تو اتفاق کرو گی کہ ہر جگہ کی اپنی ایک انفرادیت ہوتی ہے ۔ایک کشش ہوتی ہے ـــــ''

''ہوتی ہوگی ۔لیکن میرے لیے اس جگہ میں کوئی کشش نہیں ہے۔''

''ذرا سی بھی نہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''آخر کیوں ـــــ؟''میں نے کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''بس یوں ہی ـــــ''اس نے ایک خاص ادا سے اپنے شانے اُچکائے۔

میں لاجواب ہو کر رہ گیا۔عالیہ کو سمجھانا میرے بس کی بات نہیں ۔ذہانت کے ساتھ ساتھ اللہ نے اسے سلیقے سے گفتگو کرنے کی حکمت سے بھی نوازا ہے۔

مجھے اداس دیکھ کر فوراً تاڑ گئی۔

توقف کے بعد دھیرے سے مسکرا کر گویا ہوئی۔

''ایک بات کہوں؟''

''کیا ـــــ؟''

''مایوسی کفر ہے ۔امید پر دنیا قائم ہے شجاع صاحب!''

میں نے اسے غور سے دیکھا ۔اَن کہے الفاظ اس کے ہونٹوں سے پھول بن کر خوشبو لٹا رہے تھے ۔میں کسی لطیف جذبے سے سرشار ہو گیا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی ـــــ!

پندرہ

وہاں کی تیز رفتار گاڑیوں کی طرح ہمارے تعلقات بھی تیزی سے مستحکم ہوتے گئے اور پھر عورت اور مرد کے تہذیبی رشتے کو جبلی ضرورتوں کے سانچے میں ڈھالنے کا دور آگیا۔ عالیہ کے والدین نے مجھے بطور داماد قبول کر لیا۔ احباب اور اعزہ نے دعاؤں سے نوازا۔ وہاں کی رسم کے مطابق بھنے ہوئے بکرے کے گوشت اور لذیذ پلاؤ سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ دولت کی کمی نہیں تھی اور عالیہ اکلوتی اولاد تھی۔ واحد صاحب نے دل کھول کر خرچ کیا۔ اس موقع پر میرے کفیل نے بڑی مدد کی۔ سرکاری حلقے میں ان کی پہنچ تھی۔ مجھے کسی خاص پریشانی کا شکار نہیں ہونا پڑا۔ میں ان کے احسانات کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

شجاع نے بجھے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں ڈال کر دوسرا سلگایا۔ ایک لمبی سانس کھینچی اور دھوئیں کے مرغولے چھوڑے۔

میں اور رگھو خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ شام کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔

''پھر کیا ہوا ــــ؟'' رگھو نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

''ہماری شادی کے دو سال بعد واحد صاحب گزر گئے۔ یہ صدمہ عالیہ کی والدہ کے لیے اتنا شدید تھا کہ چند ہفتوں بعد وہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ کچھ عرصے تک عالیہ کی حالت بھی غیر رہی۔ دن رات اداسی کی تصویر بنی رہتی تھی۔ بڑی مشکلوں اور کوششوں سے اس کی افسردگی پر اعتدال غالب آیا۔ رفتہ رفتہ سب کچھ نارمل ہو گیا ــــ میری ذمے داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ اب دکان کا مالک میں تھا۔ ہر طرف مجھے نظر رکھنی پڑتی تھی۔ علاوہ ازیں عالیہ کے مکان کی دیکھ بھال کے فرائض بھی میرے شب و روز کی ذمے داریوں میں شامل ہو گئے۔ میری بڑھتی ہوئی پریشانیاں دیکھ کر عالیہ نے ہاتھ بٹانا شروع کر دیا اور تب ہماری زندگی پوری طرح معمول پر آ گئی۔''

''عالیہ بھابھی کے ننہال والوں نے آپ کو کیسے قبول کر لیا۔ میرا مطلب ہے کسی انڈین کو داماد کی حیثیت سے......؟'' میں نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''شروع میں اعتراضات تو بہت ہوئے تھے۔'' شجاع نے مسکرا کر کہا۔ ''لیکن عالیہ نے اس معاملے میں بڑی مدد کی۔ ڈھال بن کر سب کے آگے کھڑی ہو گئی تھی ــــ دھیرے دھیرے لوگ نرم پڑتے گئے ــــ اسی لیے واحد صاحب بھی ہمارے حق میں فیصلہ دینے پر مجبور ہو گئے تھے ورنہ......''

''نجران کیسی جگہ ہے ــــ؟'' میں نے پوچھا۔

''مضافاتی علاقہ ہے ــــ ریاض سے تقریباً ہزار کیلومیٹر کے فاصلے پر...... بہت پرسکون اور اطمینان بخش جگہ ہے- ایک دلچسپ بات بتاؤں ۔وہاں آج بھی بعض لوگ عمارتوں کی بجائے خیموں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔''

''خیمے میں؟''

''ہاں ــــ لیکن وہ خیمے بڑے شاندار ہوتے ہیں ۔وہاں ضروریاتِ زندگی کے تقریباً سارے لوازمات موجود ہوتے ہیں ۔ بڑا اچھا لگتا ہے ۔اورخاص طور پر وہاں کے بھنے ہوئے بکرے کا گوشت اور لذیذ پلاؤ کی بات ہی نرالی ہے۔'' شجاع نے چٹخارے لے کر کہا۔

اس دوران عالیہ کمرے میں داخل ہوئی۔

شجاع خاموش ہوگیا۔ ہم سب عالیہ کی طرف متوجہ ہوئے ۔اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''اگر آپ لوگ اجازت دیں ــــ'' اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا'' تو میں کھانا لگاؤں ۔؟''

''ہاں ہاں ــــ بھابی ۔یقیناً'' شجاع سے پہلے رگھو بول پڑا ۔ ہم سب ہنس پڑے۔

''آپ سب براہِ کرم بازو کے ڈائننگ ہال میں تشریف لائیں۔'' عالیہ نے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

''چلیے ــــ فرمان جاری ہو چکا ہے ۔اب اٹھنا ہی پڑے گا۔'' شجاع نے اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ ہم نے اس کی پیروی کی۔

چند لمحوں میں ہم ڈائننگ ٹیبل کے گرد اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔مغلئی کھانوں کی خوشبو سے بھوک چمک اٹھی تھی ۔سامنے میز پر قرینے سے پراٹھے، سیخ کباب، مٹن بریانی، چکن قورمہ، سلاد اور فیرنی کی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں ۔ایک طرف سفید کانچ کے گلاس رکھے ہوئے تھے ۔ پاس ہی منرل واٹر کی دو بوتلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

''یار شجاع ــــ'' رگھو چہکا'' تم نے پوری برات کا انتظام کر دیا۔ اتنا ڈھیر سارا کھانا کون کھائے گا ــــ؟''

''پہلے آپ لوگ شروع تو کیجیے۔'' عالیہ نے ہماری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس ــــ بسم اللہ کیجیے۔'' شجاع نے بھی مسکرا کر ہمیں مخاطب کیا۔

میں نے رگھو کی طرف نظر اٹھائی۔

وہ پراٹھے کا نوالہ قورمہ میں ڈبو کر منہ میں ڈال چکا تھا۔

''بہت لذیذ ہے ــــ کھاؤ۔'' اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''شجیل صاحب ۔ یہاں شرمانا منع ہے۔'' شجاع نے غالباً میری جھجک رفع کرنے کی نیت سے کہا۔

میں نے لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالا ۔کھانے میں واقعی بڑی لذت تھی۔

''بھابھی کے ہاتھوں میں جادو ہے۔'' رگھو نے بریانی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''عالیہ نے یہ جادو اپنی امی جان سے ورثے میں پایا ہے۔'' شجاع نے مسکرا کر کہا۔

''آپ خواہ مخواہ تکلف سے کام لے رہے ہیں بھائی جان۔'' عالیہ نے ادب سے مجھے مخاطب کیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔کھانا واقعی بہت لذیذ ہے۔''

''تو کھاؤ ـــــ''رگھو نے سیخ کباب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں مسکرا کر رہ گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے شجاع اور عالیہ کا شکریہ ادا کیا۔میاں بیوی نے اپنے حسنِ سلوک اور جذبۂ میزبانی سے ہمارے دل جیت لیے تھے۔دلچسپ بات یہ تھی کہ انھوں نے رگھو کا شکریہ بھی ادا کیا کیوں کہ اس نے مجھے ان لوگوں سے ملانے کا فریضہ انجام دیا تھا۔

ہم مسکراتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوتے ہی رگھو نے کہا۔

''یار مزہ آگیا۔آج کے دور میں بھی اتنے مخلص اور مہمان نواز لوگ موجود ہیں۔''

''ہاں بھئی ـــــ یہ سچ ہے۔میں ان کے ساتھ گزاری ہوئی آج کی شام کا لطف بھول نہیں پاؤں گا۔اللہ ان کو خوش رکھے اور مزید ترقیوں سے نوازے!''

''ایک بات کہوں؟''رگھو نے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں بولو ـــــ''

''مسلمان ہونے کا تم بھی کچھ فائدہ اٹھالو ـــــ''

میں مسکرایا۔

''ویزا موجود ہے۔کہو تو انتظام کر دوں؟''

''اور پاسپورٹ؟''نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے نکل گیا۔

''وہ ذمے داری بھی میری۔''رگھو نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اور اس کے عوض مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''صرف پچاس ہزار روپے کا انتظام۔''رگھو نے دائیں ہاتھ کا پنجہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''مشکل ہے ـــــ''میں نے سر جھٹک کر کہا۔

''سوچ لو ـــــ''

''سوچ لیا۔اتنے روپوں کا انتظام میرے لیے مشکل ہے۔''میں نے سپاٹ لہجے میں کہہ کر کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔گاڑی کبھی روشن،کبھی تاریک راستوں سے گزر رہی تھی۔کبھی کبھی اکادکا بجلی کے کھمبے پیچھے بھاگتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

''اگر میں روپے کا انتظام کر دوں تو ـــــ''رگھو کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''کیا مطلب؟''میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''بطور قرض ـــــ''اس نے وضاحت کی۔

''اور میں اسے اتاروں گا کیسے؟''

''وہاں سے کما کر واپس کر دینا۔ جانے کیوں تمھاری مدد کرنے کو جی چاہتا ہے۔'' رگھو نے مسکرا کہا۔

میں خاموش ہو گیا۔

''سوچ لو ـــــ اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا اپنی معاشی حالت سدھارنے کا۔''

میں نے اس کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھا۔

''لو تمھارا ہوٹل آ گیا جا کر آرام کرو۔ بقیہ باتیں کل ہوں گی۔''

گاڑی ہوٹل کے پورٹیکو میں داخل ہوئی اور استقبالیہ کے سامنے والے گیٹ کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

''اچھی بات ہے گڈ بائی ڈیئر رگھو۔''

میں گاڑی سے اترا۔ اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ نہ جانے کیوں رگھو کا آخری جملہ بار بار یاد آ رہا تھا :

''اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا اپنی معاشی حالت سدھارنے کا!''

سولہ

کمرے میں پہنچ کر میں نے اندر سے دروازہ بند کیا۔کپڑے تبدیل کیے۔ باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا اور تولیہ سے چہرہ خشک کرتے ہوئے دیوار گھڑی کی طرف دیکھا۔دس بج رہے تھے۔

ڈریسنگ ٹیبل کے قریب رکھی ہوئی میز پر کچھ رسائل پڑے ہوئے تھے۔

میں نے ان میں سے ایک رسالہ اٹھایا۔الٹ پلٹ کر دیکھا۔سرورق پر بھارت پاکستان کے پرچم لہرا رہے تھے۔ان کے نیچے بڑی سی سرخی لگی ہوئی تھی۔

تقسیمِ وطن ـــــ رحمت یا زحمت؟

میرے لبوں پر مضحکہ خیز مسکراہٹ ابھری۔

میں رسالے کے اوراق پلٹتا ہوا نرم بستر پر دراز ہو گیا اور جسم کے نصف حصے کو چادر میں چھپا لیا۔

غیر ارادی طور پر رسالے کے تین چار صفحات الٹنے کے بعد دفعتاً شانتی یاد آ گئی۔

امیر باپ کی اکلوتی بیٹی۔مجھ سے دوستی ہے۔بہت چاہتی ہے مجھے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمان سمجھ کر مجھ پر بھروسہ رکھنے کا دم بھرتی ہے۔کبھی کبھی یہ سوچ کر لرز اٹھتا ہوں کہ میری ذرا سی بے احتیاطی میری پوری قوم کو اس کی نظروں میں گرا دے گی ـــــ ماں کہتی ہے کہ ہندو کی بیٹی ہے۔مجھے بھی بے دین کر کے چھوڑے گی۔

گذشتہ سال درگا پوجا کے موقع پر میں اس کے گھر پر مدعو تھا۔

شیب پور بوٹانیکل گارڈن کے قریب بنگال انجینئرنگ کالج کے بازو میں اس کا تین منزلہ مکان ہے۔آس پاس کے علاقوں میں زیادہ تر سرکاری کالونیاں آباد ہیں جن میں رہنے والے اکثر بنگالی ہیں۔قدرے صاف ستھرا علاقہ ہے اور کسی حد تک پُر امن بھی۔

شانتی نے مجھے اپنے والد سے ملایا تھا۔پہلی ہی ملاقات میں مکھرجی بابو دلچسپ اور وسیع القلب انسان نظر آئے۔گندمی رنگ۔میانہ قد۔عمر پچاس سے کچھ اوپر اور سر کے بال حیرت انگیز طور پر سیاہ۔سفید دھوتی کرتے میں بنگالی تہذیب کے نمائندے معلوم ہو رہے تھے۔

مجھے یاد ہے۔وجے دسمی (دسہرے کا دن) کی شام درگا بھسان کے بعد انھوں نے مجھے گلے سے لگا کر آشیر واد دیا۔میں حیران نظروں سے انھیں دیکھ رہا تھا اور اُدھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''تمھارا نام تجمیل ہے؟''

''جی سر!''میں نے آہستہ سے کہا۔

''گھبراؤ نہیں۔شانتی نے تمھارے بارے میں مجھے بہت کچھ بتادیا ہے۔آئی لائک یو۔''

میں نے شانتی کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ مسکرائی۔

میں خاموش رہا۔

مکھر جی بابو نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''درگا پوجا ہم بنگالیوں کا سب سے بڑا تہوار ہے۔ایسی خوشی کے موقع پر خاموشی اچھی نہیں ـــــ کچھ بولو ـــــ مسکراؤ۔جوان آدمی ہو۔''انھوں نے میری پشت پر آہستہ سے تھپتھپا کر کہا۔

''کیا بولوں ـــــ؟بقول آپ کے شانتی نے میرے بارے میں آپ کو پہلے ہی بہت کچھ بتادیا ہے۔''میں نے ہمت جٹا کر کہا۔

''لیکن یہ نہیں بتایا کہ تم اس قدر شرمیلے بھی ہو۔''وہ قہقہہ مار کر بول پڑے۔

مجھے جھینپتا دیکھ کر شانتی نے اونچی آواز میں کہا۔

''باپی ـــــ پہلے چائے کا دور ہوجائے۔اس کے بعد سب مل کر باتیں کریں گے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔مگر چائے کے ساتھ پانی بھی لانا۔شاید تمھارے تجمیل کا گلا خشک ہو رہا ہے۔''

شانتی مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

بعد کی دو چار ملاقاتوں میں مکھر جی بابو کی شخصیت مزید کھل کر سامنے آگئی۔صاحب ثروت ہیں لیکن غرور اور رعونت نام کی کوئی چیز ان میں نظر نہیں آئی۔اپنے دھرم سے حد درجہ عقیدت رکھنے کے باوجود دوسرے مذاہب کا احترام کرنا فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔مزاج داں ہیں۔اپنے مقابل کی بات سننے سے پہلے اس کے ارادے بھانپ لیتے ہیں۔لوگوں سے فراخ دلی اور خلوص نیتی سے ملتے ہیں اور اسی بات کی تلقین بھی کرتے ہیں۔

ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھیں اسلامی تاریخ سے دلچسپی ہے۔بعض موقعوں پر میں نے محسوس کیا کہ ان کی باتوں سے گہرا مطالعہ جھانکتا ہے۔خلفائے راشدین اور ان کی فتوحات کا دھڑلّے سے ذکر کرتے ہیں۔ڈھونڈ ڈھونڈ کر حوالے بھی لاتے ہیں۔نبیﷺ کو ایک قابل ایڈمنسٹریٹر، مدبر، سچے اور مضبوط کردار والے انسان کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔

منشی پریم چند اور سعادت حسن منٹو کے دلدادہ ہیں۔غالب سے دلچسپی ہے لیکن اقبال سے کچھ زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ان کے بے شمار اشعار انھیں ازبر ہیں اور ان کے برمحل استعمال سے بھی نہیں چوکتے۔میرے سامنے کچھ اشعار وہ اکثر دہراتے رہتے ہیں مثلاً :

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تونے
وہ کیا گردوں تھا جس کا تو ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ

☆

ہفت کشور کر سکے تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس یہ ساماں بھی ہے

☆

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا

کمال تو یہ ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ مکھرجی بابو کو فارسی کے بھی بعض اشعار یاد ہیں۔ کبھی کبھی دلچسپ انداز میں ان کی تشریح بھی کرتے ہیں
۔

دورانِ گفتگو ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ ان کی زبان سے فارسی کے اشعار سن کر چونکنے کی ضرورت نہیں۔ راجہ رام موہن رائے کو فارسی کے سیکڑوں اشعار یاد تھے۔ صبح سویرے غسل کرتے وقت اکثر اشعار گنگناتے رہتے تھے۔ مہارشی دوارکا ناتھ ٹھاکر (ربندر ناتھ ٹیگور کے دادا) نے اپنی سوانح حیات میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔

مکھرجی بابو سے علمی، مذہبی، ادبی اور سیاسی موضوعات پر گفتگو کرتے وقت بہت اچھا لگتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کی سنجیدگی قابل دید ہوا کرتی ہے۔ عام حالات میں لگتا ہی نہیں ہے کہ وہ اتنے قابل انسان ہیں۔

چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کے موڈ میں انھیں پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے۔

ایک شام شانتی کے ساتھ کلکتہ کے خوبصورت تھیٹر ''نندن'' میں ستیہ جیت رے کی کلاسک فلم ''پتھیر پانچالی'' دیکھنے کا پروگرام طے پایا۔ سمر اور مایا نے بھی ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

حسبِ معمول ہمیں شانتی کے مکان پر یکجا ہونا تھا۔

میں وقت سے پہلے وہاں پہنچ گیا تاکہ اسی بہانے کچھ دیر مکھرجی بابو سے گفتگو کا موقع مل جائے۔

ان کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا شانتی ان کی طرف چائے کا پیالہ بڑھا رہی تھی۔ وہ صوفے پر دراز تھے اور تھکے تھکے سے نظر آرہے تھے۔

شانتی نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک پیالہ میری طرف بڑھا دیا۔

مکھرجی بابو مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

''آجاؤ تجمیل۔''

خلافِ توقع آج ان کی آواز میں پہلے کی طرح گرم جوشی نہیں تھی۔

''کچھ اداس اداس نظر آرہے ہیں۔'' میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ابھی ابھی نیو مارکیٹ اور بڑا بازار سے لوٹا ہوں۔''

''درگا پوجا کے بعد یہ کیسی خریداری ہورہی ہے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''بیٹی جب جوان ہوجائے تو باپ کے سر بڑی ذمے داری آجاتی ہے۔'' انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچانک ایسی باتیں کیوں؟'' میں نے شانتی کی طرف دیکھا۔اس نے منہ بنا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

''سوچتا ہوں کہ اخبار میں اشتہار دے ڈالوں۔'' انھوں نے اسی انداز سے کہا۔

''امیدواروں کی ضروری صلاحیتیں کیا کیا ہوں گی؟'' میں نے ان کے ارادے بھانپ کر مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

''لڑکے کا جغرافیہ درست ہونا شرطِ اول ہے۔''

''اور کچھ ــــ؟'' میں نے شانتی کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں سے غصہ جھانک رہا تھا۔

''ہسٹری اور اکنامکس بھی درست رکھنے والے قابل ترجیح ہوں گے۔''

''میں درخواست دے سکتا ہوں؟'' میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں کیوں نہیں۔تمھارا تو سوِس بھی تگڑا ہے۔'' وہ ایک دم سنجیدگی سے بول گئے۔

شانتی کا پارہ نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔

''باپی ــــ'' وہ پیر پٹک کر کھڑی ہوگئی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

مکھرجی بابو کا فلک شگاف قہقہہ گونج اٹھا۔

میں نے بھی ہنستے ہوئے شانتی کو آواز دی۔

''ایک کپ اور چائے ملے گی؟''

''ایسی دھماکے دار گفتگو کے بعد چائے کی امید رکھنا بے وقوفی ہے۔'' مکھرجی بابو نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ ''ہاں۔کھانا کھانے کی خواہش ہو تو نندن سے واپسی کے وقت آجانا۔ساتھ کھائیں گے۔''

''کیا کھلائیں گے؟'' میں نے ڈھٹائی سے کہا ــــ ''مچھلی؟''

''آف کورس ــــ بریانی کی خواہش ہو تو مجھے اپنے گھر بلاؤ۔کسی دن ساتھ کھائیں گے۔''

''آپ بہت زندہ دل انسان ہیں۔'' میں نے انھیں تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر مسکرائے اور کہنے لگے۔

''مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔''

''آپ اردو پڑھ سکتے ہیں؟'' میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''ہاں ــــ بے شک! چاہو تو امتحان لے لو۔''

''پھر کبھی۔'' شانتی نے کمرے میں داخل ہو کر مجھ سے کہا۔''سمر اور مایا آرہے ہیں۔میں نے بالکنی سے انھیں دیکھ لیا ہے۔اب اٹھو۔''

''اچھی بات ہے۔انکل اجازت دیجیے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کھانے پر آرہے ہو ــــ؟''

''پھر کبھی ــــ آج کی مچھلی ادھار رہی۔'' میں نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔

’’تمھاری بریانی کی طرح؟‘‘

’’بریانی آپ کو بہت جلد کھلاؤں گا۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔

’’کب ـــــ اپنی شادی میں؟‘‘

’’اس سے پہلے ـــــ‘‘

’’کیوں ـــــ؟‘‘

’’شادی میں دیر ہے۔لڑکی کی منظوری بھی تو چاہیے۔‘‘

’’وہ مولوی صاحب کے سامنے نکاح کے وقت لے لیں گے۔تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔‘‘ انھوں نے مسکرا کر کہا۔

’’زمانہ بدل رہا ہے انکل۔آپ نہیں جانتے۔قبل از وقت اگر منظوری نہیں لی اور عین وقت پر اس نے 'ہاں' کہنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟‘‘

’’گھبراؤ نہیں۔ایسی پریشانی ہوئی تو اپنی شانتی کس دن کام آئے گی۔اسی سے 'ہاں' کہلا دیں گے ـــــ‘‘

’’باپی ـــــ پھر شروع ہو گئے۔‘‘ شانتی بگڑ گئی۔

ایک مرتبہ پھر مکھرجی بابو کا زوردار قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا۔

’’کیا ہوا میرے بھائی ـــــ‘‘ سمر نے مایا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

’’لو ـــــ باراتی بھی آ گئے۔‘‘ مکھرجی بابو نے آہستہ سے کہا۔

آواز میرے کانوں تک پہنچ گئی۔میں بمشکل تمام اپنی ہنسی پر قابو پا سکا۔اس خوف سے کہ شانتی مجھ سے ناراض نہ ہو جائے، میں نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔

اور اس سے قبل کہ شانتی کے مکان میں اشانتی آ جائے ہم مکھرجی بابو سے اجازت لے کر نندن کے لیے روانہ ہو گئے!

ستره

آج ہوٹل کے کمرے میں نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔شانتی کی بہت سی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

ایک مرتبہ اس کی سالگرہ سے ایک دن قبل میں بہت پریشان تھا۔آنے والا دن یقیناً خوشی کا دن تھا' مبارک دن تھا لیکن میری الجھن یہ تھی کہ میں اس کے لیے مناسب تحفے کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ذہن کچھ کہہ رہا تھا ــــ دل کچھ اور ــــ میں عجیب کشمکش و پنج میں تھا۔دل چاہتا تھا کہ ایک بہت اچھی سی شے تحفے میں دوں لیکن ذہن فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ وہ چیز کون سی ہو جو شانتی کو بھا جائے۔سونے کا ہار میرے بجٹ کے باہر تھا۔کسی معمولی شے کے لیے دل آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

''ایسا کرو۔'' ذہن نے کہا ''اسے تانت کی بنی ہوئی بنگلہ ساڑی دے دو۔''

''نہیں ــــ'' دل معترض ہوا۔''شانتی کی پسند کی ساڑی خریدنے کے لیے اس کے ساتھ شاپنگ کرنی ہوگی۔ایسے میں سرپرائز والی بات کہاں رہی۔تحفہ ایسا ہونا چاہیے کہ اسے قبول کرنے والے کو پسند بھی آئے اور اس کے لیے ایک سرپرائز بھی ہو ــــ میرا خیال ہے کہ نیو مارکٹ سے ایک خوبصورت گلدستہ منگوا لو۔''

''سالگرہ پر صرف گلدستہ؟'' ذہن نے چیختے ہوئے کہا۔

''کیوں ــــ پھول تو سب لوگ پسند کرتے ہیں۔''

''لوگ کیا کہیں گے ــــ؟ شانتی کیا سوچے گی؟ میری سنو تو اسے ایک گفٹ چیک دے دو۔خوش ہو جائے گی۔''

''پیار میں پیسے کو گھسیٹنا مجھے پسند نہیں۔'' دل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم سمجھتے ہو پیسے کے بغیر پیار ممکن ہے؟''

''بالکل ہے۔''

''ناممکن ــــ''

''ہرگز نہیں ــــ''

''ہوش کی دوا کرو۔وہ دن ہوا ہوئے۔آج زمانہ بدل چکا ہے۔''

''شانتی ایسی نہیں ہے۔''

''نہیں ہے تو ہو جائے گی۔ یہی دورِ حاضر کا چلن ہے۔ آج کے انسان کی فطرت ہے اور ایسا ہونے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیا سمجھے؟''

''وہ ان سب باتوں سے اوپر اٹھ کر سوچتی ہے۔''

''سوچتی ہوگی لیکن سانس تو لیتی ہے اسی ماحول میں۔''

''کیوں نہ اسی سے پوچھ لیا جائے کہ اسے سالگرہ میں کیا تحفہ چاہیے؟'' دل نے بھولے پن سے کہا۔

''اس سادگی کا جواب نہیں۔ پوچھ کر کسی کو تحفہ دیتے ہیں؟''

''پھر کیسے دیتے ہیں؟''

''میرا خیال ہے ـــــ'' ذہن نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔'' ایسے موقعوں پر تحفہ قبول کرنے والے کے مزاج کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ مثلاً شاعر کو اچھا سا مجموعہ کلام، ٹیچر یا طالب علم کو قلم، لغت یا اسی طرز کی دوسری کوئی چیز دی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر کو اسٹیتھو اسکوپ وغیرہ دے سکتے ہیں۔''

''محبوبہ کک ہو تو بیلن یا کڑھائی دینی چاہیے۔'' دل نے جھنجھلا کر کہا۔

ذہن اور دل کی اس کھینچا تانی سے میں اوب گیا۔

''کسی دوست سے مشورہ کرنا چاہیے۔'' میں نے سوچا۔ فوراً ذہن میں سمر کا چہرہ ابھرا۔

جیب سے موبائل نکال کر اس سے رابطہ قائم کیا۔ خوش قسمتی سے وہ گھر پر ہی مل گیا۔

''کیا بات ہے میرے بھائی۔'' ادھر سے حسبِ معمول اس کی مانوس آواز سنائی دی۔

''تم سے ایک کام ہے۔''

''کون سا کام میرے بھائی۔''

''فون پر نہیں بتا سکتا۔ تم گھر پر رہنا۔ تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' کہہ کر میں نے سلسلۂ کلام منقطع کر دیا۔

خوش قسمتی سے سمر کے یہاں مایا بھی مل گئی۔ میں نے سوچا اچھا ہے۔ ایک نہ شد دو شد۔ اب ضرور میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

''چائے چلے گی میرے بھائی؟'' سمر نے پوچھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کیا اور کہا۔

''اچھا ہے مایا بھی یہیں ہے۔ اب تم دونوں مل کر میری پریشانی دور کرو پلیز!''

''پریشانی کیا ہے ـــــ'' مایا نے گھبرا کر کہا۔

میں نے تفصیل بتا کر کہا۔

''اب تم لوگ بتاؤ۔ میں کیا کروں؟''

دونوں مسکرا رہے تھے۔ توقف کے بعد مایا نے پہلے کہنا شروع کیا۔

''شانتی کی پسند، ناپسند کا تمھیں اب تک صحیح احساس نہیں ہو پایا؟''

''تمھیں تو ہوگا۔ وہ تمھاری سہیلی ہے۔ تم ہی بتا دو۔'' سمر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ایک بات یاد آئی۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے سمر سے کہا۔ ''تم نے مایا کی سالگرہ پر کیا تحفہ دیا تھا؟''

''یہ کنجوس کیا دے گا؟'' مایا نے مسکرا کر کہا۔

''ارے ارے ــــ تمھیں امینیہ ہوٹل میں ڈنر کے لیے لے گیا تھا۔ بھول گئی؟''

''کھانے پینے کے علاوہ اور کیا آتا ہے تمھیں؟''

''کیوں ــــ اس میں پیسے نہیں لگتے۔ اور پھر سارا کھیل کھانے پینے کے لیے تو ہے۔ تم نے سنا نہیں ہے۔ شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ :

ستائے بھوک تو ایمان ڈگمگاتا ہے
بھرا ہو پیٹ تو سنسار جگمگاتا ہے

سمر اپنی بات ثابت کر کے کسی کامیاب وکیل کی طرح فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔

''اپنا فلسفہ اپنے پاس ہی رکھو۔'' مایا نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا برائی ہے میرے فلسفے میں؟''

''برائی ہے ــــ''

''کوئی برائی نہیں ہے۔''

''برائی ہے ــــ'' مایا نے بگڑتے ہوئے کہا۔

''بس بس۔ تم لوگ عجیب ہو۔ میرا مسئلہ حل کرنے کی بجائے آپس میں لڑنے لگے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بیٹھ یار ــــ'' سمر نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ''ایک کام کر۔ مایا جو کہتی ہے تو اسی پر عمل کر جا میرے بھائی۔''

''تو اسے کچھ کہنے دے گا تب نا؟'' میں نے ناراضگی سے کہا۔

''لو ــــ میں چپ ہو گیا۔'' اس نے منہ پر انگلی رکھ لی۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ اس کے دماغ کا رائٹ پارٹ ہیز نتھنگ لفٹ اِن اِٹ اینڈ لفٹ پارٹ ہیز نتھنگ رائٹ اِن اِٹ۔''

''ماروں گی ــــ'' مایا نے آنکھ نکال کر کہا۔

''حیرت ہے۔ تم لوگ ابھی سے اس طرح جھگڑتے ہو، شادی کے بعد کیا ہوگا؟''

''فائنل کے لیے ٹریلر ضروری ہے میرے بھائی۔'' سمر نے آنکھ دبا کر آہستہ سے کہا۔

خیر ہوئی کہ مایا سن نہ سکی۔

میں نے اس کی طرف مڑ کر نرمی سے کہا۔

''ہاں مایا ـــــ اب تم ہی میری مدد کر سکتی ہو۔اپنے ذہن پر ذرا زور دو اور سوچ کر بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

وہ آنکھیں بند کر کے چند لمحے کچھ سوچتی رہی۔سمر نے سگریٹ سلگا کر پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔میں نے الجھن کم کرنے کی نیت سے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔اس دوران مایا کی بند پتلیوں میں جنبش ہوئی۔اس نے آنکھیں کھولیں اور میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''شانتی کو خوبصورت تصویریں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔''

دفعتاً کسی خیال کے تحت میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا ـــــ؟'' مایا نے پوچھا۔

میں سمجھ گیا۔

''کیا ـــــ؟''

''وہی جو مجھے کرنا ہے۔''

''کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔'' دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''آج نہیں ـــــ کل بتاؤں گا۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور مسکراتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔

اگلے دن شام کے وقت میں شانتی کے مکان پر حاضر ہوا۔مکھر جی بابو اب تک دکان سے نہیں لوٹے تھے۔

شانتی کے سامنے پہنچ کر میں نے گلدستہ اور ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''سالگرہ مبارک ہو ـــــ''

''شکریہ ـــــ'' اس نے مسکرا کر گلدستہ لے لیا۔

''یہ کیا ہے ـــــ؟'' لفافہ کے اندر انگلیاں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

''ونڈر فل ـــــ ناچتے ہوئے مور کی تصویر!''

میں نے دیکھا اس کے چہرے پر خوشیوں کی بارش ہو رہی تھی۔

''تھینک یو۔تھینک یو ڈیر!'' اس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

اور میرے ذہن میں گذشتہ ہفتے کی بات گونج اٹھی جب ہم وکٹوریہ میموریل کے مقابل اکادمی آف فائن آرٹس کے ہال میں تصویروں کی نمائش دیکھ رہے تھے اور وہاں ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شانتی نے کہا تھا کہ اسے ناچتے ہوئے مور کی تصویر بہت پسند ہے۔

شانتی کو مسرور دیکھ کر میرا دل بھی ناچ اٹھا۔

بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ تحفہ دیتے وقت اس کی قیمت سے زیادہ اسے قبول کرنے والے کی پسند کا خیال رکھنا چاہیے!

اٹھارہ

مکھرجی بابوفٹ بال کے بڑے رسیا ہیں۔سالٹ لیک اسٹیڈیم میں ایسٹ بنگال‘ موہن بگان اور محمڈن کے بڑے بڑے میچ اکثر دیکھنے جایا کرتے ہیں۔کبھی کبھی مجھے بھی اصرار کر کے اپنے ساتھ لے لیتے ہیں۔ بائچونگ بھوٹیا ان کا پسندیدہ کھلاڑی ہے۔کلکتہ کے ایڈن گارڈن میں بھارت پاکستان کا کرکٹ میچ دیکھنا کبھی نہیں بھولتے۔شاہد آفریدی کی بیٹنگ انھیں اس قدر پسند ہے کہ ایک مرتبہ اس کے آؤٹ ہوتے ہی باقی میچ چھوڑ کر اسٹیڈیم سے باہر چلے آئے۔اتفاق سے اس دن میں اور شانتی بھی ان کے ساتھ تھے۔ہم نے انھیں بہت سمجھایا کہ ابھی بھارت کی باری باقی ہے۔کم از کم سورو گنگولی کی بیٹنگ دیکھ لیں۔

”دھت —“انھوں نے منہ بنا کر کہا۔”گاڑی میں بیٹھو۔“

میں ڈرائیور کے بازو والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔باپ بیٹی پچھلی نشستوں پر دراز ہو گئے۔

میں نے مڑ کر کہا۔

”وہ ہماری ٹیم کا کپتان ہے۔اچھا کھلاڑی ہے۔!“

”اچھا کپتان ہونا ایک بات ہے اور اچھا کھلاڑی ہونا دوسری بات۔“انھوں نے بڑی صفائی سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”یعنی اس کے اچھے کھلاڑی ہونے پر آپ کو شک ہے؟“شانتی نے مسکرا کر کہا۔

”مجھے اس کا کھیل پسند نہیں۔“

”اسے کھیل کی تکنیک نہیں آتی؟“میں نے کہا۔

”آتی ہوگی۔مگر صرف تکنیک سے کیا ہوگا۔طاقت بھی چاہیے۔“

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں طاقت نہیں۔سارا بنگال اس کے کھیل کا شیدائی ہے۔دنیا کے بہترین بلے بازوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔میں خود اسے پسند کرتا ہوں۔“

”تمھاری پسند سے کیا ہوگا۔ہم بنگالیوں میں سب کچھ ہے۔طاقت نہیں ہے۔مچھلی کھاتے ہیں نا۔تمھاری طرح گوشت نہیں کھاتے۔طاقت کہاں سے آئے گی؟“مکھرجی بابو بڑے موڈ میں بولتے جا رہے تھے۔”دیکھتے نہیں۔شاہد آفریدی کتنا دم دار کھلاڑی ہے۔صبح سے شام تک بیٹنگ کرتا

رہتا ہے تب بھی نہیں ہانپتا۔اور ہمارے یہاں——؟''

میں سمجھ گیا ان سے بحث کرنا بے کار ہے۔مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

گاڑی ہوڑہ پل پر سے گزر رہی تھی۔سردیوں کی آمد آمد تھی۔دوپہر کا وقت تھا۔

دفعتاً گاڑی رک گئی۔

''کیا ہوا——؟''مکھرجی بابو نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''سامنے سے کوئی جلوس گزر رہا ہے۔''

''دیکھا——ہم لوگوں کے پاس جلسے جلوسوں کے علاوہ کچھ کام ہے؟''

میں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔بڑے جھلائے ہوئے نظر آئے۔

''آج آپ کا موڈ بگڑا بگڑا سا ہے۔؟''

''ایسے عالم میں مزاج تو بگڑے گا ہی۔بھوک لگی ہے زوروں کی اور ہم ہوڑہ پل پر اطمینان سے ہوا کھا رہے ہیں۔''

''جلوسوں کی اہمیت سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔''اس مرتبہ شانتی نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''ہاں یقیناً——میں تو بھول گیا تھا کہ ہم جس جگہ رہتے ہیں وہ جلوسوں کا شہر کہلاتا ہے۔''ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''کلکتہ کے مزاج میں احتجاج شروع سے رہا ہے۔''

''تمھیں ایک بات بتاؤں۔''مکھرجی بابو دفعتاً مسکرا کر بولے۔''دہلی کی ایک پرائمری اسٹینڈرڈ کی بچی سے ایک مرتبہ امتحان کے دوران پوچھا گیا کہ ہڑتال کسے کہتے ہیں۔اس نے جواب دیا کہ یہ بنگالیوں کے ایک تہوار کا نام ہے۔'' کہتے ہوئے وہ زور سے ہنس پڑے۔

ہم سب مسکرا اٹھے۔

گاڑی کافی دیر تک ٹریفک میں پھنسی رہی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے اکتا کر کہا۔

''اسٹیڈیم سے کھیل کے دوران اٹھ کر چلے آنا اچھا نہیں ہوا۔''

''تم نے میرا ساتھ کیوں دیا۔تمھیں کس نے میرے پیچھے آنے کے لیے کہا تھا؟''

''آپ مجھے عزیز رکھتے ہیں اسی لیے——''

''جانتے ہو۔تمھیں عزیز کیوں رکھتا ہوں؟''انھوں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''کیوں؟''میں نے تجسس سے کہا۔

''اس لیے کہ میرے بعد شانتی کی ذمہ داری کون اٹھائے گا؟''انھوں نے حسبِ معمول سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں نے شانتی کی طرف دیکھا۔

وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔

''آپ مجھے اس لائق سمجھتے ہیں ـــــ؟'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''تم اس معاملے میں اپنے آپ کو نالائق سمجھتے ہو؟''

میں اس شدید حملے کی تاب نہ لا سکا۔ میری زبان سے نکلا۔

''میں......میں......''

''بکری کی طرح میں میں کرنے سے کیا فائدہ؟ چائے پیوگے؟ شانتی ذرا دیکھنا۔ فلاسک میں چائے ہے؟'' انھوں نے کہا۔

پھر میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''برخوردار۔ ذمے داری کے نام سے یہ حال ہے۔ سر پر آ گئی تو کیا ہوگا۔''

میں سوچ رہا تھا کہ وہ حسبِ معمول یکا یک ہنس پڑیں گے لیکن ان کی سنجیدگی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

شانتی نے بے دلی سے چائے کا پیالہ بڑھا دیا۔

انھوں نے چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''جانتا ہوں۔ تم لوگوں میں عام طور سے تعلیم کی کمی ہے۔ رہائش کا مسئلہ بھی ہے۔ مذہبی معاملے میں بھی کہیں کہیں حد سے زیادہ قدامت پسندی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بعض معاملات میں تعلیم کی کمی کے سبب گمراہی بھی ہے۔ لیکن اب بھی تمھارے یہاں سچائی ہے۔ خلوص ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ ایک صحیح مسلمان اپنے برادرانِ وطن کا صحیح ہمدرد ہوتا ہے۔ تم لوگ بھروسے کے قابل ہو۔''

''بھروسہ اور اس پر ـــــ؟'' شانتی نے میری طرف دیکھ کر منہ بنایا۔

''کیا کمی ہے اس میں؟''

''لو اچھا موقع ہے۔'' شانتی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''مسلمان ہونے کا فائدہ اٹھا لو۔''

''اس میں فائدہ اٹھانے کی کیا بات ہے۔'' مکھرجی بابو نے میری وکالت کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''جس کا جو حق ہے اسے ملنا چاہیے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پورے مغربی بنگال میں میرا داماد بننے کے لائق اگر کوئی ہے تو......''

''باپی ـــــ مجھے ایسی باتیں پسند نہیں۔'' شانتی بگڑ کر بولی۔

''لڑکی ذات ہے۔'' مکھرجی بابو نے مجھے آنکھ مار کر آہستہ سے کہا۔ ''شرماتی ہے۔ سمجھ گئے نا'' اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مسکراؤں یا شانتی کو مناؤں!

انیس

بچپن سے شانتی کو ربندر سنگیت اور نذرل گیتی سے دلچسپی رہی ہے۔ کالج کے سالانہ جلسوں میں وہ اکثر حصہ لیا کرتی تھی۔ ربندر سنگیت کی سیدھی سادی دھنیں ہوں یا نذرل گیتی کے کلاسیکی سر۔ دونوں طرح کے نغموں میں پوری مہارت کے ساتھ اپنے ترنم کا جادو جگاتی ہے۔ اسٹیج پر ہارمونیم لے کر بیٹھتی ہے اور گانا شروع کرتی ہے تو سماں بندھ جاتا ہے۔ طبلے پر سمر اس کا ساتھ دیتا ہے۔ میں اور مایا تالیوں سے ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی شانتی اور سمر کی جوڑی اتنی کامیاب ہوتی ہے کہ مایا مجھے چھیڑتی ہے۔

''اب شانتی گئی تمھارے ہاتھ سے۔''

''مجھے تو سمر کی فکر ہے۔'' میں سنجیدگی سے کہتا ہوں۔ ''کہیں اس نے تمھیں چھوڑ کر شانتی کا ہاتھ پکڑ لیا تو تمھارا کیا ہوگا؟''

''شجیل، ویری بیڈ!'' وہ مصنوعی غصے سے کہتی ہے۔ میں مسکرا کر رہ جاتا ہوں۔

اس دن کلکتہ کے خوبصورت آڈیٹوریم ربندر سدن میں ''ربندر نذرل سندھیا'' کے عنوان سے سرکاری سطح پر ایک پروگرام ہونا طے پایا تھا۔ مکھرجی بابو بارسوخ آدمی ہیں۔ محکمۂ اطلاعات کے افسران سے اچھے مراسم ہیں۔ انھوں نے ہماری فرمائش پر شانتی کے لیے پروگرام میں شرکت کی صورت نکال دی۔

ہم مقررہ وقت سے ڈیڑھ گھنٹے قبل شانتی کے مکان پر یکجا ہوئے۔

مکھرجی بابو تیار بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

میرے پیچھے سمر اور مایا بھی کمرے میں داخل ہوئے۔

''شانتی کہاں ہے؟'' مایا نے پوچھا۔

''وہ تیار ہو رہی ہے۔ تم لوگ بیٹھو۔'' مکھرجی بابو نے کہا۔

ہم ان کے سامنے بچھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''جانتے ہو ــــ ربندر ناتھ ٹیگور کون تھے؟'' انھوں نے نہ جانے کس خیال سے کہا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا جیسے سوال سمجھ میں نہ آیا ہو۔

''میرا مطلب ہے کہ تم ربندر ناتھ کو کس حیثیت سے جانتے ہو؟'' انھوں نے میری پریشانی بھانپ کر کہا۔

''ظاہر ہے ایک بہت بڑے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے۔ سب جانتے ہیں کہ انھیں ۱۹۱۳ئ میں ادب کا سب سے بڑا انعام یعنی نوبل پرائز ملا تھا۔ ان کی سدا بہار نظموں اور لافانی کہانیوں کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔'' میں ایک سانس میں کہتا گیا۔

وہ مسکرائے۔ سمر اور مایا بھی میری طرف متوجہ تھے۔

''ان کے نوبل پرائز کا علم ہمیں اور تمھیں ہے۔ باہر والوں کو نہیں۔ جانتے ہو؟'' مکھرجی بابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' آج غیر ممالک میں انھیں شاعر کی حیثیت سے یاد نہیں کیا جاتا۔ وہاں کی نئی نسل انھیں کسی اور حوالے سے یاد کرتی ہے۔''

''میرے ساتھ سمر اور مایا بھی انھیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے دوبارہ کہنا شروع کیا'' افسوس کی بات یہ ہے کہ آج باہر والے ربندرناتھ کو ایک مصور کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں اونچے داموں فروخت ہوتی ہیں۔''

''مطلب یہ ہوا کہ ہم لوگوں نے ان کی تصویروں کو نہیں سمجھا۔ ہم انھیں مصور کی حیثیت سے صحیح مقام نہیں دے پائے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ربندرناتھ کو اس زاویے سے بھی سنجیدگی سے دیکھیں اور ان کا صحیح مقام متعین کریں۔'' مکھرجی بابو نے مسکرا کر کہا۔

''میں تیار ہوں ـــــ'' دفعتاً شانتی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ سلک کی ہرے رنگ کی ساڑی اور اس سے میل کھاتے ہوئے بلاؤز میں بہت حسین نظر آرہی تھی۔ پیشانی پر ہرے رنگ کی بندیا بھی لگا رکھی تھی۔ ہاتھوں میں ہرے کانچ کی چوڑیاں تھیں۔''

''فنٹاسٹک!'' میری زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

مکھرجی بابو نے میری طرف دیکھا اور میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

''اب چلیں۔ میرے بھائی۔'' سمر نے مسکرا کر کہا۔

ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

ربندرسدن کا ایئر کنڈیشنڈ ہال بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج کے چاروں طرف سفید پھولوں کی لڑیاں لہرا رہی تھیں۔ ایک جانب ربندرناتھ اور نذرل کے بڑے بڑے پورٹریٹ رکھے ہوئے تھے۔ دوسری جانب اناؤنسر کے لیے مائیک لگا ہوا تھا۔ درمیان میں ہارمونیم اور طبلے نظر آرہے تھے۔

میں، مایا اور مکھرجی بابو سامنے کی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تقریب کے آغاز کا انتظار کر رہے تھے۔ شانتی اور سمر گرین روم میں جا چکے تھے۔

دفعتاً گلابی ساڑی باندھے ایک خوبصورت خاتون نے اسٹیج کے کنارے رکھے ہوئے مائیک کے سامنے آکر آداب کہا۔

ہم لوگ متوجہ ہو گئے۔

ہال کی روشنی آہستہ آہستہ بجھنے لگی۔ اسٹیج کی روشنی مزید تیز ہوگئی۔

اناؤنسر نے رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد صدر جلسہ سے ربندرناتھ اور نذرالاسلام کی تصویروں کو پھولوں کے ہار پہنانے کی گزارش کی۔

بعد ازاں اعلان کے مطابق شہر کی ایک مشہور گلوکارہ کو محفل کے مبارک آغاز کی دعوت دی گئی۔

افتتاحیہ گیتوں کے بعد اسٹیج پر سے شانتی اور سمر کے نام پکارے گئے۔

وہ دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوئے۔

ہم نے تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔

شانتی اپنے مخصوص انداز میں ہارمونیم کے سامنے بیٹھ گئی۔سمر نے طبلے پر پاؤڈر چھڑک کر اور ٹھوک بجا کر دیکھا۔پھر شانتی کو اشارے سے شروع کرنے کو کہا۔

شانتی نے آہستہ سے کھانس کر گلا صاف کیا اور اپنے مخصوص انداز میں نغمہ چھیڑا۔

''تو مار پوجار چھلے تمائے بھولے ای تھا کی (تمھاری عبادت کے دکھاوے میں تمھیں ہی بھولا رہتا/ بھولی رہتی ہوں) مکھرجی بابو آنکھیں بند کیے جھوم رہے تھے۔میں نغمے کے بول اور شانتی کے ترنم میں ڈوبتا جارہا تھا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے سامعین پوری توجہ اور خاموشی سے نغمے کا لطف لے رہے تھے۔شانتی اور سمر نے اپنی مشترکہ کوششوں سے سامعین پر سحر طاری کر دیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا محفل اپنے عروج پر پہنچتی جارہی تھی۔شانتی نے ربندرناتھ کے نغموں کے علاوہ نذرالاسلام کے گیت بھی گائے اور لوگوں سے داد و تحسین وصول کی۔تقریباً نصف گھنٹہ شانتی کے گانے فضا میں لہراتے رہے اور سامعین سر دھنتے رہے۔

اختتام پر پتہ نہیں چلا کہ وقت کیسے گزر گیا۔

میں دل ہی دل میں شانتی کی قابلیت کا قائل ہورہا تھا۔واقعی اللہ نے اسے خوبصورت ترنم سے نوازا ہے۔گیتوں کے انتخاب کی صلاحیت بھی اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔کسی فن کار کی کامیابی میں سامعین کی پسند کی آگاہی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔مجھے لگتا ہے کہ شانتی اس بات سے بخوبی واقف ہے۔

ہر نغمے کے اختتام پر سامعین کی طرف سے پیدا ہونے والی تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے اس بات کا اندازہ ہورہا تھا کہ شانتی کسی پیشہ ور گلوکارہ سے کسی صورت کم نہیں ہے۔

جلسے کے اختتام پر صدرِ مجلس نے شانتی سے مصافحہ کرتے ہوئے مبارک دی۔

مکھرجی بابو نے اسے سینے سے لگا لیا۔

ہم سب کے چہروں پر خوشیاں لہرارہی تھیں!

بیس

مکھرجی بابو کے گھر کی ایک روایت مجھے بہت پسند ہے۔کسی شاعر'ادیب' مفکر یا فنکار کا یوم پیدائش منانے کا ان کا منفرد اور دلچسپ انداز ہے۔اس دن باپ بیٹی صبح سے رات تک اپنی گفتگو اور دیگر مشاغل کے دوران کسی نہ کسی حوالہ سے اس فنکار کو یاد کرتے ہیں۔اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یکم جولائی کے دن سارا مغربی بنگال اپنے محبوب رہنما ڈاکٹر بدھان چندر رائے کی سالگرہ مناتا ہے۔ان کی تصویر کی گلپوشی کرتا ہے۔ان کے سلسلے میں تقریری تقریبات منعقد کرتا ہے۔لیکن مکھرجی بابو کے یہاں تمام دن بدھان چندر کے روزمرہ کے مشاغل اور ان کی زندگی کے سلسلے میں ناشتے سے لے کر کھانے کی میز تک چھوٹی بڑی باتوں کا ذکر ہوتا ہے۔حد تو یہ ہے کہ اس دن وارد ہونے والے مہمان کو بھی اسی رنگ میں رنگ جانا پڑتا ہے۔

میں ایسے موقعوں پر قصداً ان کے یہاں پہنچ جاتا ہوں۔بڑا لطف آتا ہے۔ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران کبھی کبھی بڑے کام کی باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ایسے نکتے نکل آتے ہیں جو لمبی لمبی تقریروں پر بھاری ہوتے ہیں۔

ہر سال ربندرناتھ،ایشور چندر،نذرالاسلام،مائیکل مدھوسدن،راجہ رام موہن رائے اور بنکم چندر کا جنم دن مکھرجی بابو اپنے مخصوص انداز میں منانا نہیں بھولتے ہیں۔اسی طرح غالب،اقبال،پریم چند،سرت چندر چٹرجی،ستیہ جیت رے،اتم کمار،سبھاش مکھوپادھیائے اور دیگر عظیم ہستیوں کو بھی یاد کرتے ہیں۔

میں ایک مرتبہ علامہ اقبال کے یوم پیدائش کے موقع پر قصداً مکھرجی بابو کے یہاں حاضر ہوا تاکہ شاعرِ مشرق کے سلسلے میں ان کے مطالعہ سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔شام کا وقت تھا۔مکان کی چھت پر چائے کا دور چل رہا تھا۔شانتی موقع موقع سے گفتگو میں حصہ لے رہی تھی۔

دفعتاً مکھرجی بابو نے سوال اٹھایا کہ اقبال کو ڈاکٹریٹ کا علمی درجہ پہلے حاصل ہوا یا ''سر'' کا خطاب؟ میں تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ شانتی نے میری ہمت بندھائی۔

''میرا خیال ہے ـــــ''میں نے ہمت جٹا کر کہا۔''انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری پہلے ملی تھی۔''

''کہاں سے ملی ـــــ؟''انھوں نے دوسرا سوال داغ دیا۔

''شانتی ـــــ کچھ تم بتاؤ۔''میں نے بندوق اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جرمنی سے ــــــ ''اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میں نے تم سے سوال کیا تھا۔''مکھرجی بابو نے کہا۔

گرچہ شام کی فضا میں خنکی آچکی تھی۔ چھت پر ہوائیں بھی چل رہی تھیں اور گفتگو بھی دلچسپ تھی لیکن مجھے پسینے آنے لگے۔ لگتا تھا کلاس روم میں امتحان دے رہا ہوں۔

''اس دفعہ سوال کا جواب تم دو گے۔''مکھرجی بابو نے چاے کا پیالہ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''جرمنی سے ڈاکٹریٹ کا اعزاز انھیں کیوں دیا گیا؟''

''نہیں معلوم ــــــ ''میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں بتاؤں؟''شانتی نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اچھی بات ہے ــــــ تم ہی بتاؤ۔''وہ مسکرائے۔

''شیخ محمد اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے پہلے انگلستان گئے۔ وہاں کیمبرج میں کامیابی سے وقت گزارنے کے بعد جرمنی پہنچے۔ اور علمی دولت سے مالا مال ہو کر وطن لوٹ آئے۔ انھوں نے یورپ کے قیام کے دوران فارسی کی بے شمار علمی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اور اس مطالعے کا خلاصہ ایک اہم کتاب کی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب میں فلسفہ ایران کی تاریخ موجود ہے۔ اس بہترین کتاب کو دیکھ کر جرمنی والوں نے شیخ محمد اقبال کو ڈاکٹر کے رتبے سے سرفراز کیا۔ اس کے بعد انگریزی سرکار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور تب انھیں ''سر'' کا خطاب عطا کیا۔''شانتی نے اپنی بات ختم کر کے میری طرف تحسین طلب نظروں سے دیکھا۔

ایک بنگالی کنبے میں علامہ اقبال کے سلسلے میں اتنی ڈھیر ساری باتیں سن کر حیرت ہو رہی تھی۔ شانتی اگر اس وقت تنہا ہوتی تو میں اس کا منہ چوم لیتا۔

شاید مکھرجی بابو کی تجربہ کار نگاہوں نے میرے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کو پڑھ لیا۔ میں جھینپ گیا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا۔

''علامہ اقبال کی چند مشہور نظموں کے نام بتاؤ۔''

''ہمالہ، نیا شوالہ، شکوہ، جواب شکوہ، بچے کی دعا، ترانۂ ہندی وغیرہ وغیرہ۔''میں نے جلدی جلدی کہا۔

''نظم شکوہ کے کچھ بند سناؤ۔''انھوں نے اسی انداز میں کہا۔

میں نے شانتی کی طرف بے بسی سے دیکھا۔

''خبردار ــــــ! شانتی نو ہلپ۔''وہ چلائے۔

شانتی مسکرا کر رہ گئی۔

اور اس وقت مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جب مکھرجی بابو نے خود نظم ''شکوہ'' سنانا شروع کی۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں

فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں

جیسے جیسے نظم آگے بڑھ رہی تھی مجھے ان کی قوتِ حافظہ پر رشک آ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ایک مخصوص آہنگ سے پوری نظم سنا گئے۔

میں دم بخود تھا۔

ابھی میں اس سحر سے آزاد نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے مجھے پکارا۔

"شجیل —— کہاں کھو گئے؟"

میں نے دیکھا ان کے چہرے پر بزرگانہ رعب طاری تھا۔ مسکرا کر گویا ہوئے۔

"اب تمھاری باری ہے۔ جوابِ شکوہ سناؤ۔"

"میں ——؟ میرا حافظہ اتنا مضبوط نہیں۔ ہاں آپ کہیں تو دو ایک بند سنا سکتا ہوں۔"

"ویری بیڈ۔" اس بار شانتی نے کہا۔

"اس بے چارے کی مدد کرو۔" مکھرجی بابو رحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے شانتی سے بولے۔

"بالکل نہیں۔" اس نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"اسے خود نظم یاد نہیں۔ مدد کیا خاک کرے گی۔" میں نے تاؤ دلایا۔

حربہ کام کر گیا۔

شانتی نظم سنانے کے لیے تیار ہو گئی۔ سب سے پہلے اس نے اپنی چائے ختم کی —— پیالہ ٹرے میں رکھا اور کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے یوں نظم کا آغاز کیا۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

....

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

شانتی نے نہایت اطمینان سے نظم ختم کی اور میں ایک مرتبہ پھر سکتے میں آ گیا۔ ایسی روانی اور ایسا حافظہ۔ خدا کی پناہ۔ مکھرجی بابو کی تربیت کی جیتی جاگتی مثال شانتی کے آگے میں اپنا سر جھکانے پر مجبور ہو گیا!

اکیس

شانتی کو خدا نے تقریری صلاحیت سے بھی نوازا ہے۔ محفل بڑی ہو یا چھوٹی۔ اسٹیج پر سیاسی رہنما ہوں یا ادبی شخصیتیں۔ وہ بلا جھجک تقریر کرتی ہے اور اس طرح کہ سامعین کا دل جیت لیتی ہے۔ دورانِ تقریر کہاں ٹھہرنا ہے' کہاں تیزی سے گزر جانا ہے ــــ کہاں آواز اونچی ہونی چاہیے۔ کہاں مدھم ــــ ہر بات کا لحاظ رکھتی ہے۔ مقابلوں میں کئی مرتبہ انعامات حاصل کر چکی ہے۔ اس کے جوہر خصوصاً اس وقت کھل کر سامنے آتے ہیں جب وہ فی البدیہہ تقریر کے مقابلے میں حصہ لیتی ہے۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ کسی تقریر کے لیے اس کے پاس مواد کم بھی رہتا ہے تو وہ اپنی تکنیک اور باڈی لینگویج کے ذریعہ سامعین پر سحر طاری کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔

میں نے ایک دن مکھرجی بابو سے ان کی دہلیز میں باتوں باتوں میں پوچھ لیا۔

''شانتی میں یہ صلاحیت کس طرح پیدا ہوئی ہے؟''

وہ خاموشی سے مسکرائے۔

''کیا آپ اپنے کالج کے دنوں میں اچھے مقرر رہے ہیں؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''بالکل نہیں ــــ'' وہ ہنوز مسکرا رہے تھے۔

''شاید اسکول میں ایسے مقابلوں میں شانتی حصہ لیتی رہی ہوگی؟''

''اسکول میں وہ حد درجہ شرمیلی واقع ہوئی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس میں یہ صلاحیت کالج پہنچ کر پروان چڑھی؟''

''بتاتا ہوں ــــ چاے پیو گے؟'' انھوں نے ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

انھوں نے ملازم سے چاے لانے کو کہا۔

''شانتی ــــ؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی ضرورت سے لائبریری گئی ہوئی ہے۔ بہر کیف میں تمھارے سوال کی طرف آرہا ہوں۔ دراصل اس کے پیچھے ایک واقعہ ہے۔ تم

جانتے ہو ضدی بچے اکثر گھر والوں کی ڈانٹ پھٹکار کے شکار ہوتے ہیں ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے بچوں کی تربیت میں تھوڑی سی احتیاط برتی جائے تو وہ آگے چل کر مصمم ارادے والے ثابت ہوتے ہیں اور زبردست قوتِ ارادی کے مالک بن جاتے ہیں ۔شانتی بھی بچپن سے ضدی واقع ہوئی ہے ۔اپنی ماں کے گزر جانے کے بعد وہ اور بھی ضدی ہوگئی ۔ایک مرتبہ اسکول میں دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد رخصت ہونے والے بچوں کو الوداعیہ دیا گیا تھا۔شانتی بھی انھی میں شامل تھی ۔اس کی کسی سہیلی نے اسے شرمیلی ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ کبھی اسٹیج پر تقریر نہیں کر سکتی ۔بس پھر کیا تھا۔اسی دن اس نے ٹھان لی کہ وہ ایک کامیاب مقرر بن کر دکھادے گی ۔''

اس دوران ملازم چائے دے گیا۔

مکھرجی بابو نے ایک پیالہ میری طرف بڑھا دیا اور دوسرا اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگایا۔

''تم بھی پیو۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی ۔

تھوڑی دیر تک ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے ۔

مکھرجی بابو آنکھیں بند کیے کچھ سوچتے رہے ۔

''پھر کیا ہوا ــــــ؟''میں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور گہری سانس لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''اسی دن سے اس نے محنت شروع کی ۔بعض اچھے مقرروں کی کتابیں خریدیں ۔ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا۔اکثر تنہا کمرے میں خود کو بند کر لیتی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر گھنٹوں تقریر کرتی رہتی ۔کہیں کوئی پروگرام ہوتا تو پوری توجہ سے مقررین کو سنتی اور ایک ایک بات نوٹ کرتی ۔ لگتا تھا کہ اس کی زندگی کا یہی ایک مقصد ہے ۔مجھے اس کے پاگل پن کا وہ دور آج بھی یاد ہے ۔''

میں انھیں بغور سن رہا تھا اور شانتی کے متعلق سوچ کر عش عش کر رہا تھا۔

تھوڑے وقفے کے بعد مکھرجی بابو نے کہنا شروع کیا۔

''غالباً چھ سات مہینے کے عرصے میں اس کی جان توڑ محنت رنگ لے آئی ۔اس نے مقامی لائبریری میں ہونے والے جلسے میں پہلی بار کتب بینی پر تقریر کی ۔میں حیران تھا کہ موضوع کے مطابق اس نے اتنی ڈھیر ساری معلومات کہاں سے یکجا کر لیں ۔تقریر کے اختتام پر علاقے کے ایم ۔ ایل ۔اے ۔نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے آشیرواد دیا۔اس دن وہ بہت مسرور تھی ۔''

''ہلو ایوری باڈی ــــــ''دفعتاً شانتی کمرے میں داخل ہوئی ۔

''اتنی جلدی آ گئی ۔''مکھرجی بابو نے پوچھا۔

''لائبریری میں کتاب جلدی مل گئی اس لیے آ گئی ۔مگر یہاں میری غیر موجودگی میں کیا ہو رہا ہے؟''اس نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں ــــــ''میں نے فوراً کہا۔

''کہیں میری شکایت تو نہیں ہو رہی تھی؟'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ـــــ ہم تو تمھاری تعریف کر رہے تھے۔''

''وہ تو میں ہوں تعریف کے قابل ـــــ کیوں باپی؟''

''بے شک ـــــ!'' مکھرجی بابو مسکرائے۔

''تم خوش نصیب ہو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس میں خوش نصیبی کی کیا بات ہے؟''

''اللہ نے تمھیں کئی خوبیوں سے نوازا ہے۔''

''میں اللہ کو نہیں مانتی ـــــ'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''بھگوان کو مانتی ہو؟''

''بات ایک ہی ہے۔ مجھے ایمان، عقیدہ، وشواس جیسے الفاظ سننا پسند نہیں۔''

''کیا پسند ہے؟''

''اپنے آپ پر بھروسہ، اپنی ذات پر اعتماد۔'' اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

''اللہ یا بھگوان پر بھروسہ نہیں ہے؟'' میں نے اسے کریدنے کی نیت سے کہا۔

''نہیں ـــــ''

''کوئی وجہ؟''

''کئی ایک ـــــ''

''مثال کے طور پر ـــــ؟''

''تم نے انھیں دیکھا ہے؟''

''تم نے ہوا کو دیکھا ہے؟'' میں نے سوال جڑ دیا۔

''غلط لاجک سے کام نہ لو۔'' اس نے آنکھ دکھا کر کہا۔

''ہوا کو محسوس کرتی ہو یا نہیں؟ جواب دو۔''

مکھرجی بابو خاموش تھے لیکن ان کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ ہماری باتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ لبوں پر حسبِ معمول مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''ہوا کو محسوس کرنا الگ بات ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ ہوا ایک طاقت ہے۔''

’’اور اسے پیدا کرنے والا ـــــ؟‘‘میں نے جملہ قصداً ادھورا چھوڑ دیا۔

’’تمھارا مطلب ہے کہ ہوا کو کسی نے پیدا کیا ہے۔ اگر اسے سچ مان لیا جائے تو سوال ہے کہ وہ دکھائی کیوں نہیں دیتا؟‘‘

’’یہ اس کی خوبی ہے۔ یا یوں کہو کہ یہ اس کی فطرت ہے۔‘‘

’’دکھائی نہ دینا فطرت ہے؟‘‘اس نے مضحکہ خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

’’بالکل ـــــ ہوا میں آبی بخارات موجود ہیں لیکن وہ دکھائی نہیں دیتے۔‘‘

’’پھر غلط لاجک؟‘‘اس نے آنکھ دکھائی۔

’’جیسے پانی کی فطرت ہے اونچائی سے نیچے کی طرف بہنا۔ ہائیڈروجن گیس کی فطرت ہے نیچے سے اوپر اٹھنا۔ عورت کی فطرت ہے بچے پیدا کرنا۔ مرد کی فطرت ہے......‘‘

’’ایک منٹ ٹھہرو۔‘‘اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔’’مجھے تمھارے اللہ اور بھگوان میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔‘‘

’’دلچسپی نہ ہونے کا سبب؟‘‘میں نے اسے گھیرنے کی نیت سے کہا۔

’’تمھارے اللہ بھگوان سے جڑا ہوا ہے مذہب‘ دھرم۔ اور آج کے سارے جھگڑے کی جڑ یہی ہے۔ لہٰذا آرام سے رہنا ہے تو اس جھمیلے کو چھوڑنا ہوگا۔‘‘

’’علامہ اقبال نے کہا ہے کہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔‘‘

’’بالکل سچ ـــــ‘‘اس مرتبہ مکھرجی بابو چہک اٹھے۔

لیکن آج کے ماحول میں یہ سچ ہے کہ سارے جھگڑے کی جڑ یہی ہے۔‘‘شانتی نے زور دے کر کہا۔

’’ہم لوگ اندر آسکتے ہیں ـــــ؟‘‘سمر اور مایا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

’’آجاؤ بھئی۔‘‘مکھرجی بابو نے اونچی آواز میں کہا۔

’’تمھارے لیے ایک پیغام ہے۔‘‘سمر نے شانتی کو مخاطب کیا۔

’’کیسا پیغام؟‘‘

’’آئندہ اتوار کی شام یونیورسٹی ہال میں ایکس ٹمپور لیکچر کمپٹیشن ہونے جارہا ہے۔ تمام ایکس اسٹوڈنٹس کو دعوت دی گئی ہے۔ جاؤ گی؟‘‘

’’بالکل جاؤں گی۔‘‘شانتی نے پرجوش لہجے میں کہا۔

’’فی البدیہہ تقریری پروگرام سے مجھے دلچسپی ہے۔ میں بھی چلوں گا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ انکل بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔‘‘میں نے مکھرجی بابو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’یقیناً جاؤں گا ورنہ شانتی کو چیئرزاپ کون کرے گا-؟‘‘انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’کیوں ـــــ ہم لوگ اس کی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں شامل نہیں ہیں؟‘‘سمر نے کہا۔

’’اس کا فیصلہ اتوار کی شام کو ہوجائے گا-‘‘انھوں نے اس انداز سے کہا کہ ہم سب مسکرا اُٹھے!

بائیس

کلکتہ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ ہال میں سامعین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ہم سب اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مکھر جی بابو شانتی کی تقریر محفوظ کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر کے بٹن کی جانچ کر رہے تھے۔ ان کے دائیں طرف سمر اور رمایا تھے اور بائیں طرف میں۔

اسٹیج پر صدر جلسہ وزیر اطلاعات، کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، کارپوریشن کے میئر اور کلچرل سکریٹری اپنی اپنی کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔

سامنے میز پر دو بڑی طشتریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک میں امیدواروں کے نام اور دوسری میں موضوعات کی پرچیاں تھیں۔

خاتون اناؤنسر نے افتتاحی کلمات ادا کرنے کے بعد طشتریوں سے پرچیاں نکالیں اور یکے بعد دیگرے تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

تین مقررین کے بعد چوتھی پرچی شانتی کے نام کی نکلی۔ ادھر موضوعات کی پرچی نکال کر اناؤنسر نے اعلان کیا۔ ''ایشور چندر ودیا ساگر ــــــ آپ کی نظر میں''

شانتی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔

وہ مسکراتی ہوئی کرسی سے اٹھی اور اسٹیج پر پہنچی۔

وہاں کی چکاچوند روشنی کے بیچ ہلکے نیلے رنگ کی بنارسی ساڑی میں شانتی مزید خوبصورت نظر آ رہی تھی۔

اس نے ایک نظر سامعین پر ڈالی اور نہایت خوبصورت انداز میں پورے اعتماد کے ساتھ تقریر شروع کی۔

مکھر جی بابو نے ٹیپ ریکارڈ کا سوئچ آن کر دیا۔

ہال میں شانتی کی آواز گونجی۔

''صدر محترم، اسٹیج پر رونق افروز دیگر مہمانانِ کرام اور معزز سامعین!

سب سے پہلے جلسے کے منتظمین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے مجھے یہاں مدعو کیا اور اس مقابلے میں حصہ لینے کا خوبصورت موقع فراہم کیا۔ میں صدر محترم کی اجازت سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتی ہوں۔

ایشور چندر ودیا ساگر ــــــ ایک ایسا نام ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ ایک اتنا بڑا نام ہے جس کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے سو بار سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں دورانِ گفتگو انجانے میں ان کی شان میں کوئی گستاخی سرزد نہ ہو جائے۔ بہر کیف اس کے لیے میں پیشگی معذرت چاہتی ہوں۔

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کا بنگال کیسا تھا۔اس وقت کیسے حالات تھے۔کیسا ماحول تھا۔آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد یہاں کے حالات میں کیسا بدلاؤ آیا۔ بنگال کے نواب کو تخت سے معزول کر دیا گیا اور برطانوی کمپنی نے اپنے مفاد کے لیے ایک کٹھ پتلی کو نواب کی مسند پر بٹھا دیا۔ پھر کچھ عرصے بعد حکومت کی باگ ڈور کمپنی نے اپنے ہاتھوں میں لے لی۔اس وقت ایک طرف دیسی تہذیب تھی جو توہم پرستی کا شکار تھی۔دوسری طرف بدیسی تہذیب جو سائنسی علوم سے مالا مال تھی۔دھیرے دھیرے دونوں تہذیبوں کے میل جول کا دور شروع ہوا۔زندگی کے مختلف شعبوں میں نئی نئی تحریکوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ آیا۔مذہب، سماجی رسم رواج، تعلیمی نظام اور ادب سبھی اس سے متاثر ہوئے ـــــ یہی وہ ماحول تھا جب ۲۶ ستمبر ۱۸۲۰ء کو برسنگھا، ضلع ہگلی، موجودہ مغربی مدنی پور میں ٹھاکر داس کے گھر ایشور چندر پیدا ہوئے۔"

شانتی نے ایک نظر اسٹیج پر بیٹھے مہمانوں پر ڈالی اور قدرے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔

حضرات!

مجھے موضوع دیا گیا ہے۔ودیا ساگر، میری نظر میں۔

سب سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ یہاں ایک مختصر سی گفتگو میں مجھے دیے گئے موضوع کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ودیا ساگر کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ان کی خدمات کی کئی جہتیں ہیں اور میں انھیں کس نظر سے دیکھتی ہوں، یہ تمام باتیں تفصیل طلب ہیں۔بہرکیف میں مختصراً اپنی باتیں آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

ودیا ساگر ماہر تعلیم، بنگالی نثر کے خالق اور انسانیت کے علمبردار تو تھے ہی، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ حقوقِ نسواں کے طرف دار تھے۔ میں اسی نکتے پر اپنی آج کی گفتگو مرکوز رکھنا چاہتی ہوں۔ودیا ساگر بنیادی طور پر ایک دردمند انسان تھے۔مرد اساس معاشرے میں عورتوں پر روز افزوں ہونے والے مظالم سے ان کا دل دکھتا تھا۔وہ عورتوں کے مسائل کو دور کرنا اپنا پہلا فرض سمجھتے تھے اور اس کی ادائیگی کے لیے انھوں نے باقاعدہ ایک حکمتِ عملی تیار کی۔

حضراتِ گرامی!

ڈیڑھ سو سال پہلے کا بنگال یقیناً آج کے جیسا نہیں تھا۔ودیا ساگر نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ عورتوں کی ترقی میں آنے والی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے اس بیماری کو مارنا ہوگا جس کی جڑیں بنگالی معاشرے میں گہرائی تک پیوست ہو چکی تھیں۔یہ بیماری تھی جہالت کی۔عورتیں تعلیم کی اہمیت تو کجا اس کے نام سے واقف نہیں تھیں۔تعلیم پر صرف مردوں کا حق تسلیم کیا جاتا تھا۔ودیا ساگر اس نکتے سے اچھی طرح واقف تھے کہ عورتیں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد ہی اپنے حقوق کو پہچان سکیں گی اور تب مردوں کے برابر حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کر سکیں گی۔لہٰذا ودیا ساگر نے تعلیم نسواں کی ترقی اور پھیلاؤ کو ایک مشن کے طور پر قبول کیا اور ایک کامیاب حکمتِ عملی کے ذریعہ اس پر کام کرنا شروع کیا۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے بیوہ عورتوں کے حقوق کے لیے بھی سنجیدگی سے جدوجہد کی۔سب سے پہلے ان کی دوسری شادی پر پابندی کو دور کرنے کی تحریک چلائی۔ودیا ساگر کا خیال تھا کہ ہندو مردوں پر پابندی لگائی جائے کہ وہ ایک سے زائد شادی نہ کریں۔کیوں کہ ایسا کرتے ہوئے وہ اکثر عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے اور نتیجے کے طور پر بے چاری عورتیں طرح طرح کے مظالم کا شکار ہوتی ہیں۔اس طرح

ان دو خطوط پر چلتے ہوئے ودیا ساگر نے پست حال عورتوں کو معاشرے میں اونچا مقام دلانے کی زوردار تحریک چلائی۔

سب سے پہلے انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعلیمی کمیٹی کے صدر جے۔ڈبلیو۔بیتھون کے عورتوں کے اسکول میں سکریٹری کا عہدہ قبول کیا اور پھر بیتھون صاحب کی معاونت سے اس اسکول کی ترقی میں انھوں نے دن رات ایک کر دیے۔آپ جانتے ہیں کہ بعد میں یہی اسکول بیتھون کالج کے نام سے مشہور ہوا۔تعلیم نسواں کے مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے انھوں نے سو سو جتن کیے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ودیا ساگر نے لڑکیوں کو اسکول لے جانے والی گاڑیوں تک پر فروغِ تعلیم نسواں کے نعرے اور پیغامات لکھوائے۔یہ ودیا ساگر کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ عورتوں کے لیے کلکتہ یونیورسٹی کے دروازے کھول دیے گئے۔تاریخ میں کادمبنی اور چندر مکھی نامی دو عورتوں کا ذکر آتا ہے جنھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۱۸۸۳ء میں ان دونوں نے بی۔اے۔کا امتحان بھی پاس کیا۔اور یہی نہیں بلکہ چندر مکھی باسو نے تو اگلے سال ایم۔اے۔بھی پاس کر لیا اور اس طرح پہلی بنگالی ایم۔اے۔خاتون ہونے کا ریکارڈ قائم کیا۔"

سامعین نے تالیاں بجائیں۔شانتی نے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔

"ودیا ساگر کی دوسری مہم تھی بیواؤں کی دوسری شادی کا حق۔اس صبر آزما تحریک میں انھیں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔عوامی ذہن کو بیدار کرنے کے لیے دستی خطوط تقسیم کرائے۔مضامین لکھے۔کتابچے شائع کیے۔اور یہی نہیں بلکہ ہندو شاستروں کی مدد سے بیواؤں کی دوسری شادی کو درست ثابت کرنے کے لیے انھوں نے دن رات کڑی محنت کی اور آخر کار "پرسار سمبیتا" کے حوالے سے یہ ثابت کر دیا کہ بیوائیں دوسری شادی کر سکتی ہیں۔

انھوں نے اس تحریک میں سب سے پہلے نہایت ہشیاری سے اپنے والدین کو شامل کیا۔انھیں اعتماد میں لینے کے بعد ودیا ساگر نے کھل کر کام کرنا شروع کر دیا۔قدامت پسند ہندوؤں کی جانب سے اعتراضات ہوئے۔انھوں نے ڈٹ کر ان کا سامنا کیا۔کبھی ہار نہیں مانی اور آخر کار بیواؤں کی دوسری شادی کو قانونی حیثیت دلانے میں کامیاب ہو گئے۔ان کی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ ان کے چھوٹے بیٹے نے باپ کی کوششوں پر لبیک کہتے ہوئے ایک بیوہ سے شادی کر لی۔

کامیاب تحریکوں کے کامیاب محرک ایسے ہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔جو قول و فعل سے اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہیں، اپنے ارادوں پر جمے رہتے ہیں- یقیناً ایسے لوگ کسی بھی قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں۔بنگال کی تاریخ میں جہاں بنگلہ زبان اور تعلیمی معاملات میں ودیا ساگر کے کارنامے جلی حرفوں میں لکھے جائیں گے۔وہیں تعلیمِ نسواں اور حقوقِ نسواں کے سلسلے میں ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ایسے لوگ اپنی خدمات کے ذریعہ ہمیشہ عوام کے ذہن و دل میں زندہ رہتے ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔

شکریہ!!"

تقریر کے اختتام پر سارا ہال زوردار تالیوں سے گونج اٹھا۔

شانتی مسکراتی ہوئی اسٹیج سے نیچے اتری۔مکھرجی بابو نے بڑھ کر اسے شاباشی دی۔

ہم سب اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے!

تیئس

ستمبر کی شام تھی ۔زوردار بارش سے راستے کیچڑ آلودہو چکے تھے ۔شہر کے بعض نچلے علاقے زیرآب ہو چکے تھے ۔ہمارا محلہ جلد ہی زیرآب ہو جاتا ہے لیکن دریا کے قریب ہونے کے سبب گھڑی بھر میں تمام پانی نکل کر دریا میں مل جاتا ہے۔

میں دفتر سے گھر لوٹا تو ایک خوشگوار حیرت سے دو چار ہوا۔

دروازے پر ماں نظر آگئی۔ چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

قریب پہنچا تو اونچی آواز میں کہنے لگی۔

''آج تو نے بڑی دیر کردی ــــ''

''دفتر میں کچھ کام تھا ــــ لیکن تم مسکرا کیوں رہی ہو؟''

''رو کر اپنے بیٹے کا استقبال کروں؟''

''میرا مطلب ہے کہ آج اچانک......''

''دفتر سے جلدی گھر آیا کر۔میرا نہیں تو کم از کم اس کا خیال کر......''

''اس کا ــــ کیا مطلب؟'' میں حیران تھا۔

ماں معنی خیز انداز سے مسکرائی۔

''وہ آئی ہے ــــ اور تیرا انتظار کر رہی ہے۔''

میں ایک انجانے خوف سے اچھل پڑا۔

''کون آئی ہے ــــ؟''

''اپنا نام شانتی بتاتی ہے۔'' ماں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔'' کہتی ہے وہ تیری دوست ہے ــــ''

''اور کیا کہا اس نے ــــ؟'' میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

جواب نہ پا کر میں نے مڑ کر دیکھا۔عقب میں ماں نہیں تھی۔

دفعتاً کچن سے اس کی آواز آئی۔

''ہاتھ منہ دھو کر آجا۔یہیں چائے رکھی ہے۔''

تھوڑی دیر میں ہم تینوں چائے پی رہے تھے۔

شانتی کا چہرہ ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔وہ کتابوں کی الماری' دیواروں پر آویزاں غالب' ٹیگور اور اقبال کی تصویریں اور طاق پر سجی ہوئی میری کچھ ٹرافیاں دیکھ رہی تھی۔

دفعتاً ماں کی آواز نے اسے چونکایا۔

''بیٹی ـــــ تم لوگ کہاں کی ہو؟''

شانتی کے چہرے پر کئی رنگ ابھرے۔ایسا لگا اسے یہ سوال پسند نہیں آیا۔ایک لمحہ چپ رہنے کے بعد آہستہ سے بولی۔

''بنگلہ دیش ـــــ''

''گھر میں اور کون کون لوگ ہیں؟'' ماں کی رسمی گفتگو جاری تھی۔

''پتاجی ـــــ اور میں!''

''اور تمھاری ماں ـــــ؟''

''بنگلہ دیش کے فساد میں ماں اور چھوٹا بھائی ہلاک ہو گئے۔گھر جلا دیا گیا۔سامان لوٹ لیے گئے۔میں اس وقت بہت چھوٹی سی تھی۔ بڑی مشکلوں سے ہم لوگ جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔''

''تم لوگوں کے ساتھ بہت برا ہوا۔'' ماں نے تاسف آمیز لہجے میں کہا۔

''پہلے مذہب کی بنیاد پر ملک تقسیم ہوا اور خون کی ندیاں بہائی گئیں-'' شانتی انتہائی جذباتی انداز میں کہہ رہی تھی ـــــ ''پھر زبان کی بنیاد پر پاکستان کے ٹکڑے ہوئے اور دلوں میں نفرت کا بازار اس قدر گرم ہوا کہ برسوں کی رواداری اور محبت خاک میں مل گئی۔جنونیوں نے لوگوں کو چن چن کر مارا۔مجھے ذرا ذرا خیال آتا ہے کہ راستے کے کنارے نالوں میں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔بھاری بوٹوں والے چہل قدمی کر رہے تھے اور جنونی شیطانی رقص میں مصروف تھے۔'' کہتے کہتے شانتی ہانپنے لگی۔

میں نے دیکھا اس کے چہرے پر غصہ ہی غصہ نظر آرہا تھا- وہ غصہ نہیں جو انسان کو انسان سے دور کر دیتا ہے بلکہ وہ غیظ وغضب ـــــ جو عموماً ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ کر دیتا ہے۔

میں نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

''ماں جانتی ہو ـــــ شانتی کھانا بنانے کی بڑی شوقین ہے۔''

''اچھا ـــــ کیا کیا بنا لیتی ہے۔'' ماں نے بھی غالباً موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے کہا۔

شانتی میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

''مچھلی کی دو خاص ڈشیز بناتی ہے۔ایک ہلسا مچھلی کو بھاپ دے کر اور دوسری بھٹکی مچھلی کو کیلے کے پتے میں رکھ کر...... بہت لذیذ، بہت مزے دار ـــــ''میں نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''بھاپ اور کیلے کے پتے میں مچھلی؟''ماں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں ماں ـــــ اسی سے پوچھ لو۔''

اس دوران شانتی قدرے نارمل ہو چکی تھی۔مسکرا کر کہنے لگی۔

''کسی دن ماں کو لے کر ہمارے یہاں آجاؤ۔''

''بس اسی بات کی کمی ہے۔''میں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں ـــــ؟''وہ حیرت سے بولی۔

''ماں کے لیے گھر سے باہر نکلنا بہت مشکل ہے۔''

''آخر کیوں ـــــ؟''

''ہمارے پرکھوں نے اس گھر میں دولت جو چھپا رکھی ہے۔''

ماں نے مجھے آنکھیں نکال کر دیکھا۔

''اسے تو ڈاکٹر کے یہاں لے جانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔''

''دوست سے ماں کی شکایت کرتا ہے۔''ماں نے بگڑ کر کہا۔

''بالکل نہیں۔میں تو تمھاری تعریف کر رہا تھا۔''میرا لہجہ شرارتی ہو گیا۔

شانتی ہنس پڑی۔میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں یہ بتاؤ۔آج تمھارا یہاں آنا کیسے ہوا؟''

''بس یوں ہی ـــــ فرصت تھی۔جی میں آیا چل کر تمھارا گھر دیکھ لوں۔''

''کیسا لگا؟''

''اچھا نہیں ـــــ''

میں اور ماں اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

''لیکن ماں بہت اچھی لگی۔''وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کیوں ـــــ؟''

''ماں کو بچپن میں کھو چکی ہوں۔یہاں آ کر ماں سے ملی تو ایک عجیب احساس سے دو چار ہوئی۔اگر فسادات نہ ہوئے ہوتے تو آج بھائی کے ساتھ میری ماں بھی زندہ ہوتی ـــــ''کہتے کہتے وہ ایک بار پھر اداس ہو گئی۔

''خیر ـــــ اب پرانی باتوں کو بھول جاؤ بیٹی۔میرے دروازے تمھارے لیے کھلے ہوئے ہیں۔جب خواہش ہو ماں سے ملنے چلی آنا۔''

''شکریہ ـــــ اب مجھے چلنا چاہیے۔''

''بیٹی ـــــ پہلی بار ہمارے گھر آئی ہو۔کھانا کھا کر جانا۔''

''نہیں ماں ـــــ پھر کبھی۔گھر پر باپی اکیلے ہوں گے۔''

''کسی دن ان کو بھی ساتھ لے کر آنا۔''

''اچھی بات ہے۔''اس نے مسکرا کر اپنا وینٹی بیگ اٹھایا اور صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔''آتی ہوں۔آداب۔''

''خوش رہو ـــــ ''ماں نے مسکرا کر کہا۔

''میں اِسے سڑک تک چھوڑ کر آتا ہوں۔''کہتا ہوا میں اس کے ساتھ ہو گیا۔

راستے کیچڑ آلود تھے۔وہ بچ بچ کر چل رہی تھی۔

''بارش نہ ہو تو مشکل ـــــ ہو جائے تو مشکل۔''وہ مسکرا کر بولی۔

''ہاں ـــــ نہ ہو تو سوکھا۔ہو جائے تو کیچڑ!''میں مسکرایا۔

ہم گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔

''پہلے کبھی نہیں بتایا کہ تم لوگ بنگلہ دیش سے آئے ہو ـــــ؟''میں نے چلتے چلتے یوں ہی پوچھ لیا۔

''کیا بتاتی ـــــ؟ اتنے تلخ تجربے ہوئے ہیں کہ سوچ کر ڈر لگتا ہے۔''اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے قبل وہ بول پڑی۔

''جانتے ہو۔سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیں لوٹنے والوں میں وہی لوگ شامل تھے جو ہمارے دن رات کے ساتھی تھے ۔ہمارے دکھ سکھ کے حصے دار تھے۔''

''کبھی کبھی انسان جانور سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔''میں نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں ـــــ اس دور میں ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔''شانتی نے نفرت سے کہا۔

''جانتی ہو میری ماں بیوہ کیسے ہوئی؟''

اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''پندرہ سال پہلے شہر سے آنے والی ایک زہریلی آگ نے ہمارے گاؤں کو جلا کر راکھ کر دیا اور میرے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔''

وہ مجھے حیران نظروں سے دیکھنے لگی۔

''تمھارے ساتھ بھی ـــــ؟''

''ہاں ـــــ''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

باتیں کرتے کرتے ہم ٹیکسی اسٹینڈ تک آ گئے۔

ایک خالی گاڑی کو میں نے اشارہ کیا۔وہ قریب آ کر رک گئی۔

”آؤ ——!“ دروازہ کھولتے ہوئے میں نے کہا۔

شانتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے دبایا اور کہا۔”آئی ایم ساری۔“

گاڑی چلی گئی۔

اور میری زبان پر بھی غیر ارادی طور پر ’ساری‘ آ گیا!

چوبیس

شانتی کے جانے کے بعد یکا یک بے اختیار ابو کی یاد آ گئی۔

پندرہ برس پہلے......

لکھنؤ سے کچھ دور ایک خوبصورت گاؤں میں ہم لوگ رہتے تھے۔ رحیل احمد صاحب کے نام سے ابو لوگوں میں مقبول تھے۔ مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ان کی خصوصیت تھی کہ تعلیم سے زیادہ تربیت پر توجہ دیتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ انسان انسان کے کام نہ آئے تو اس کا جینا بے کار ہے۔ دادا، دادی کب انتقال کر گئے مجھے علم نہیں۔ چچا اور بڑے ابو بھی اپنے اپنے کنبے کے ہمراہ ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ صرف باورچی خانے اور غسل خانے الگ الگ تھے۔ چچا لکھنؤ میں کسی دوا کی دکان میں کام کرتے تھے۔ بڑے ابو کچہری میں ایک وکیل کے اسٹنٹ ہوا کرتے تھے۔ ابو کھیتی باڑی اور سماجی کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھتے تھے۔ لیکن سیاست سے دور دور رہا کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ پورے خاندان میں کل پانچ بچے تھے۔ چچا کے دو لڑکے ارشاد اور نوشاد، بڑے ابو کی دو لڑکیاں عسریٰ اور بشریٰ اور ایک میں۔ ہم پانچوں بھائی بہن گاؤں کے ہائی اسکول میں پڑھتے تھے۔

گاؤں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ مندر مسجد کے علاوہ ڈاک خانہ، کھیل کا میدان، کشتی کا اکھاڑہ اور ایک چھوٹی سی عید گاہ بھی وہاں تھی۔

ابو قمیص اور دھوتی پہننا پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھی تہواروں میں پاجامہ بھی پہن لیتے تھے۔ سگریٹ اور پان سے انھیں بیر تھا لیکن چائے سے بے حد لگاؤ تھا۔ گھنٹے گھنٹے چائے پیتے تھے۔ امی کسی بات پر بگڑ تیں تو اسی چائے کے سبب۔ کبھی کبھی اونچی آواز میں کہتیں ــــ

”کھانا بنانا دشوار ہو جاتا ہے۔ ہر وقت چائے کی فرمائش۔ یہ بھی کوئی عادت ہے۔“

”چائے ہی تو مانگتا ہوں ــــ“ ابو مسکرا کر کہتے۔

”چائے ہی ــــ“ امی ان کی نقل اتارتی ہوئی کہتیں۔ ”چائے چائے کر کے سارا گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں اور کہتے ہیں چائے ہی ــــ“

کبھی کبھی پڑوس کی کملا چاچی ابو کی مدد کے لیے ہاتھوں میں چائے کا پیالہ لے کر آ جاتیں۔ کسی ایسے ہی موقع پر ایک دن ابو نے کہا :

”دیکھو، کملا دیدی میرا کتنا خیال رکھتی ہیں۔“

''ٹھیک ہے ـــــ آج سے اپنی چائے کا ٹھیکہ انھی کو دے دیجیے۔ اب مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔''

''دیدی ـــــ اب بس بھی کرو۔'' کملا چاچی نے مسکرا کر کہا۔ ''بھیا کو چائے تو پی لینے دو۔ پھر جی بھر کے ڈانٹنا۔''

''ایک کام کرو ـــــ'' ابو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کملا دیدی کی چائے تو میں نے پی لی۔ اب کھیتوں کی طرف جا رہا ہوں۔ واپسی میں دیر ہو سکتی ہے۔ اگر باورچی خانے میں چائے ہو تو تھرمس میں تھوڑی سی دے دو۔''

ان کی اس بات پر کملا چاچی اور امی دونوں ہنس پڑیں۔

کملا چاچی مجھے بہت چاہتی تھیں۔ میرے لیے ہمیشہ دودھ دہی دے جایا کرتی تھیں۔ ایک بھینس تھی۔ اس سے کافی دودھ مل جایا کرتا تھا گھنشیام چاچا ریٹائرڈ فوجی تھے۔ جنگ میں اپنا ایک پاؤں گنوا چکے تھے۔ لیکن بیساکھی نہیں لیتے تھے۔ فوجی ہسپتال سے نقلی پاؤں لگوایا تھا۔ ہمت اتنی کہ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی فوج میں ڈال دیا تھا۔ کہتے تھے کہ فوجی ڈر جائے تو دھرتی ماں کی حفاظت کون کرے گا۔

کبھی کبھی ہم پانچوں بھائی بہن رات کے وقت گھنشیام چاچا کے کمرے میں پہنچ جاتے اور ان سے جنگ اور فوجیوں کے متعلق کہانیاں سنتے تھے۔ برف پوش پہاڑوں پر رہنے والے اور ملک کی حفاظت کرنے والے جوانوں کے قصے سن کر مجھے بھی ایک فوجی بننے کی خواہش ہوتی تھی۔ گھنشیام چاچا میری دلچسپی کو محسوس کر کے خوش ہوتے اور کہتے کہ سچا فوجی بننے کے لیے وطن سے سچی محبت کرنا پہلی شرط ہے۔ میں اس شرط پر پورا اُترنے کے لیے دل ہی دل میں تہیہ کرتا رہتا تھا۔

''اندھیری رات تھی۔'' ایک رات ہم بھائی بہن گھنشیام چاچا کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران رونما ہونے والے کسی واقعے کا ذکر کر رہے تھے۔ ''آسمان پر تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ لیکن اندھیرا گہرا تھا ـــــ ہماری ڈیوٹی سرحد پر تھی۔ پہاڑوں کے دامن میں ہمارے لیے کیمپ لگے ہوئے تھے۔ ہم لوگ کل ملا کر چالیس جوان وہاں سرحد کی نگرانی کر رہے تھے۔ جون کا مہینہ تھا لیکن سردی کم نہیں تھی۔ ہوائیں سائیں سائیں چل رہی تھیں۔''

چاچا نے ٹھہر کر بیڑی سلگائی اور کش لینے لگے۔

''پھر کیا ہوا ـــــ؟'' عسریٰ اور بشریٰ نے یک زبان ہو کر کہا۔ ارشاد اور نوشاد بھی متجسس تھے۔

''بتاتا ہوں ـــــ'' انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پھر ایسا ہوا کہ کہیں سے دھماکے کی آواز آئی۔ دھم دھم ـــــ اور اس کے بعد خاموشی۔''

''پھر کیا ہوا ـــــ؟'' میں نے پوچھا۔

''آواز سنتے ہی ہم لوگوں نے پوزیشن لے لی۔ اپنی اپنی جگہ پر ہتھیار لے کر ہم دوسرے دھماکے کی آواز سننے کا انتظار کرنے لگے تاکہ صحیح دِشا کا حساب لگایا جا سکے۔''

''اس کے بعد ـــــ'' ارشاد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''پھر ایک دھماکہ ہوا اور دور سے ایک روشنی نظر آئی۔ ساتھ ہی ہمارے افسر کی کڑک دار آواز ابھری۔ جوان ہوشیار۔ لگتا ہے کہ دشمن نے رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر حملہ کر دیا ہے۔''

''تب آپ لوگوں نے بھی حملہ کر دیا ہوگا ـــــ'' نوشاد نے معصومانہ انداز میں کہا۔

''ہمارے افسر نے ہمیں فائرنگ کا حکم ہی کہاں دیا۔صرف ہشیار رہنے کا آرڈر دیا تھا ـــــ سو ہم لوگ پوری طرح ہشیار ہو گئے تھے۔''

''اس کے بعد کیا ہوا چاچا ـــــ؟'' میں نے پوچھا۔

''اس رات ہم سب حیران تھے۔رک رک کر دھماکے ہوتے رہے اور روشنی نظر آتی رہی۔لیکن ہمارے کیمپ کے آس پاس نہ کوئی بم آ کر گرا اور نہ ہی کوئی دوسری انہونی گھٹی۔ساری رات ہم پہرہ دیتے رہے۔افسر تھوڑی تھوڑی دیر پر ہمیں ہشیار کرتا رہا۔دھیرے دھیرے اندھیری رات بھور کی طرف بڑھتی رہی۔وقت گزرتا رہا' گزرتا رہا.....''

''رات بھر آپ سب لوگ جاگتے رہے ـــــ؟'' عسریٰ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں' ہاتھوں میں رائفل لیے۔دشمن کے کسی بھی حملے کا جواب دینے کے لے ہمارے تمام جوان ساری رات جاگتے رہے ـــــ لیکن بھگوان کا شکر ہے کہ کوئی گھٹنا نہیں گھٹی ـــــ اور دھیرے دھیرے بھور ہونے لگی۔چاروں طرف ہلکا ہلکا اُجالا پھیلنے لگا۔لیکن دھند اب بھی اتنی گہری تھی کہ کوئی چیز صاف صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔دفعتاً افسر کی آواز گونجی۔جوان ہشیار! سرحد پر کوئی سایہ نظر آ رہا ہے جو آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔جب تک آرڈر نہ دیا جائے کوئی فائر نہیں کرے گا۔دھندلی روشنی میں دوربین سے دیکھنے کے باوجود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ سایہ کون ہے جو ہماری طرف آہستہ آہستہ بڑھتا آ رہا تھا۔''

''وہ سایہ کون تھا ـــــ؟'' بشریٰ نے کہا۔

چاچا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پہلے تو ہم نے سمجھا کہ یہ دشمن کی کوئی چال ہے۔اس نے سرحد پر روبوٹ اتارا ہے۔ہوسکتا ہے اس میں بم فٹ کر دیا گیا ہو۔وہ ہمارے پاس پہنچے گا اور پھٹ پڑے گا اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے کیمپ جل اٹھیں گے۔ہمارے چیتھڑے اُڑ جائیں گے ـــــ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔روبوٹ آہستہ آہستہ ہمارے کیمپ کے پاس آ گیا اور تب ہمارے چہرے حیرت سے پھیل گئے۔''

''کیوں چاچا ـــــ؟'' ہم سب ایک ساتھ پوچھ بیٹھے۔

''وہ روبوٹ کوئی اور نہیں بلکہ ایک دس بارہ سال کا بچہ نکلا جو موٹے کپڑے اور اونی ٹوپی پہنے ہوئے ہلتے ڈولتے ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور ہمیں حیرت سے دیکھتا رہا۔میں نے افسر کی طرف دیکھا۔ہم سب حیران تھے۔

دفعتاً بچے کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ زمین پر گرنے والا ہی تھا کہ ہمارے افسر نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔تیزی سے اسے کیمپ کے اندر لایا گیا۔اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔جلدی جلدی اسے دوائیں دی گئیں۔ہاتھ پاؤں اور چہرے پر گرم تیل کی مالش کی گئی ۔کافی دیر کے بعد بچے نے آنکھیں کھول دیں۔

ہم سب مسکرا اٹھے۔

''وہ بچہ کس کا تھا ـــــ؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''اصل میں وہ اُس پار کے کسی بڑے افسر کا بیٹا تھا جو بدقسمتی سے اپنے لوگوں سے بچھڑ کر ہماری طرف آنکلا تھا۔بعد میں ہمارے افسر کو وائر لیس پر خبر ملی کہ روشنی کے دھماکے اس بچے کو تلاش کرنے کے لیے کیے جا رہے تھے۔ پھر ہم نے وہ منظر دیکھا جس پر آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔''

''کون سا منظر ـــــ؟''عسری نے پوچھا۔

''جو کام حکومتوں سے نہ ہو سکا۔ بندوقوں سے نہ ہو سکا وہ اس بچے کے ذریعہ ہو گیا۔''

''اچھا ـــــ کیسے؟''اس مرتبہ بشریٰ نے پوچھا۔

''ہمارے افسر نے سرحد پر جا کر اس پار کے افسر سے ملاقات کی۔ بچہ اس کے حوالے کیا۔ اُدھر کے افسر نے شکریہ ادا کیا۔ پھر دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کے گلے لگے اور ہاتھ بھی ملایا۔

ـــــ دیکھا بچو! تمھارے اندرا یشور نے کیسی شکتی دے رکھی ہے۔ تمھاری وجہ سے سرحدیں مٹ جاتی ہیں۔ لوگوں کے دل مل جاتے ہیں۔''

ہم نے دیکھا چاچا کے چہرے پر خوشی بکھری ہوئی تھی!

پچیس

''بھابھی۔کملاکوبھی ایسی سوئیاں بنانا سکھادو۔''ایک دن ہمارے آنگن میں چار پائی پر بیٹھے عید کی سوئیاں کھاتے ہوئے گھنشیام چاچانے کہا۔

''سکھانے کی کیا ضرورت ہے۔آپ جب چاہیں میں بنادوں گی۔''امی نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں ــــــ''ابو نے جلدی سے کہا۔''اس سے مجھے بھی فائدہ ہوگا۔''

''کیسا فائدہ؟''چاچانے ان کی طرف مڑ کر دیکھا۔

''آپ کے ساتھ مجھے بھی سوئیاں کھانے کو مل جائیں گی۔''ابو نے مسکرا کر کہا۔

''زندگی میں ایک ہی افسوس رہ گیا۔''یکا یک چاچانے اداس ہوتے ہوئے کہا۔

''کیسا افسوس؟''ابو نے پوچھا۔

''کسی مسلم گھرانے میں شادی ہوئی ہوتی تو......''

اب کملا چاچی سے چپ نہیں رہا گیا۔فوراً بول پڑیں۔

''تو اب کون سی دیر ہوگئی ہے۔''

''اب اس عمر میں مجھ لنگڑے کو کون پوچھے گا ــــــ''چاچانے اسی انداز میں کہا۔

چاچی نے آنکھیں دکھائیں۔

سب ہنس پڑے۔

دفعتاً بڑے ابو اور چچا گھبرائے ہوئے آنگن میں آئے اور گھنشیام چاچا کو دیکھ کر یک بیک رک گئے۔

''کیا بات ہے ــــــ؟''ابو نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''شہر میں فساد ہوگیا۔فسادیوں نے ہماری مسجد پر دھاوا بول دیا ہے۔''بڑے ابو نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''امام صاحب اور مؤذن صاحب کو بھی چوٹیں آئی ہیں۔''چچانے کہا۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔''گھنشیام چاچانے اٹھتے ہوئے کہا۔

''گاؤں سے باہر والی پکی سڑک پر بعض نوجوانوں نے ایک سائیکل سوار کو پکڑ کر بری طرح پیٹ ڈالا ہے۔حالات بہت بگڑ گئے ہیں۔کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''بڑے ابّو جلدی جلدی بول رہے تھے۔

''کچھ نہیں ہوگا۔میں دیکھتا ہوں۔''گھنشیام چاچا نے کملا چاچی کو گھر چلنے کا اشارہ کیا۔

ابّو نے امی کو اندر کمرے میں جانے کی تلقین کی۔

ان کے جانے کے بعد چچا نے اپنی اونچی آواز میں کہا۔

''ہندوؤں نے آج حد کر دی ـــــ عید کے دن ـــــ مسجد پر حملہ ـــــ توبہ توبہ ـــــ انھیں مزہ چکھانا چاہیے۔''

''خاموش رہو ـــــ چند لوگوں کی شر پسندی کے سبب تمام لوگوں کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا غلط بات ہے۔''ابو نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''رحیل ـــــ''بڑے ابو نے ٹوکا۔''معاملہ صرف چند لوگوں کا نہیں ہے۔یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔پچھلے سال محرم کے موقع پر ایسا ہی ہنگامہ ہوا تھا۔بات یہ ہے کہ کچھ لوگ ہمارے آگے ننگے ہو جائیں تو ہماری آنکھیں بند کر لینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ہمیں انھیں ان کی بے لباسی کا احساس دلانا ہوگا۔''

''احساس دلانا اور مزہ چکھانا دو الگ الگ باتیں ہیں۔''ابو اپنی بات پر پوری طرح اڑے رہے۔

دیکھتے دیکھتے آنگن میں آس پاس کے لوگ بھی آ گئے۔

''اب ہمیں کیا کرنا چاہیے ـــــ؟''کسی نے چیخ کر کہا۔

''سب سے پہلے ہمیں اپنے ذہن سے یہ بات نکال دینی چاہیے......''ابو نے کھڑے ہو کر تقریر کے انداز میں کہنا شروع کیا ـــــ''کہ مسجد پر حملہ ہندوؤں نے کیا ہے ـــــ یہ معاملہ ہندو مسلمان کا ہرگز نہیں ہے۔یہ صرف چند گمراہ لوگوں کا کام ہے۔''

''تو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟''چچا نے غصے میں کہا۔

''نہیں ـــــ ایسی بات نہیں ہے۔''ابو نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔''ہمیں اپنے دوسرے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل بیٹھ کر مشورہ کرنا چاہیے۔اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ہمیں اپنے گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کی مل جل کر حفاظت کرنی چاہیے۔ہم بٹ گئے تو جان لیجیے کہ ہم کمزور ہو جائیں گے۔مصیبت کا مقابلہ مل جل کر کرنا چاہیے۔ہمیں ایک دوسرے پر بھروسہ رکھنا چاہیے نہ کہ......''

''اگر وہ ہم پر حملہ کر دیں تو-؟''کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

''ایسا نہیں ہوگا۔ہمیں آج شام کے وقت گاؤں کے سب لوگوں کے ساتھ ایک میٹنگ کرنی چاہیے۔یہ بہت ضروری ہے۔تم ایک کام کرو۔''ابو نے چچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا''گاؤں کے مکھیا،ڈاکٹر صاحب،امام صاحب،مندر کے پجاری،گھنشیام بھائی اور دوسرے لوگوں کو آج شام چوپال میں میٹنگ کی خبر دے دو۔''

''ہماری ذرا سی خوشی ان سے دیکھی نہیں جاتی۔''چچا بڑبڑی کے ساتھ کہہ رہے تھے۔''سال بھر کے تہوار کو عین وقت پر خاک میں ملا ڈالا۔''

''حوصلہ رکھو۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔میں جو کچھ کہہ رہا ہوں پہلے اس پر عمل کرو۔''

''ٹھیک ہے۔میٹنگ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔لیکن مجھے اب اُن پر بھروسہ نہیں رہا ـــــ''چچا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''اللہ پر بھروسہ ہے نا ـــــ اتنا ہی کافی ہے۔اب جاؤ۔آپ تمام لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔''ابو نے دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔''اور یاد رکھیں کہ آپ سب کی یہی کوشش ہونی چاہیے کہ کہیں سے کوئی الٹی سیدھی بات سنائی دے تو اس پر آنکھیں بند کر کے یقین نہ کر لیں۔ایسے موقعوں پر افواہوں سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔''

حسبِ توقع شام کے وقت چوپال میں میٹنگ ہوئی۔

گاؤں کے بڑے بوڑھے سبھی موجود تھے۔ابو کی بات سے سب نے اتفاق کیا کہ ہمیں مل جل کر اپنے گاؤں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ایک دوسرے پر شک کرنے کی بجائے اعتماد اور بھروسے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے ـــــ

گھنشیام چاچا نے ایک عجیب سی تجویز رکھی۔انھوں نے کہا۔

''یہ سچ ہے کہ ہم سب امن وسکون کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ہمیں لڑائی جھگڑا بالکل پسند نہیں۔لیکن کبھی کبھی حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں ـــــ اس لیے آج سب سے پہلے ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہم ایسے حالات نہ پیدا ہونے دیں۔مثال کے طور پر ایسے موقعوں پر افواہیں آگ میں تیل کا کام کرتی ہیں۔اس لیے میرا سجھاؤ ہے کہ آج رات ہمارے گھروں میں کوئی ٹرانسسٹر یا ٹی وی نہیں چلائے گا۔خبریں صحیح ہوں یا غلط،کہیں نہ کہیں ان کا اثر ہمارے دل اور دماغ پر پڑتا ہی ہے۔''

''لیکن حکومت یا پولیس نے ہنگامہ روکنے کے لیے کیا کیا۔اس کی جانکاری تو ضروری ہے؟''کسی نے آواز اٹھائی۔

''لیکن کبھی کبھی زیادہ جانکاری مصیبت بن جاتی ہے۔''گھنشیام چاچا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

ابو نے تھوڑی دیر تک غور کرنے کے بعد یہ تجویز مان لی۔دوسرے لوگ بھی دو تین دنوں تک اس پر عمل کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔

''ہمیں گاؤں کے باہر سے آنے والی کسی بھی بات پر چونکنا نہیں ہوگا۔''ابو نے آخر میں کہا۔''کسی فرقے کے متعلق کوئی بھی بات ہو ہمیں سختی سے اسے اپنے ذہن سے جھٹک دینا ہوگا۔ضرورت ہوئی تو کل شام ہم پھر اسی جگہ جمع ہوں گے اور اپنی اپنی بات رکھیں گے۔''

خدا خدا کر کے میٹنگ ختم ہوئی۔ابو نے راحت کی سانس لی۔

اس دن گھر کی تمام عورتیں ڈری ڈری سی تھیں۔ہم سب بچے بھی چپ چپ سے تھے۔نہ جانے کب کون سی بری خبر آجائے اور کوئی ہنگامہ ہو جائے ـــــ

اسی رات دروازے پر ہونے والی دستک سے میری نیند ٹوٹ گئی۔امی ابو بھی اٹھ گئے۔کوئی لگاتار دروازہ پیٹ رہا تھا۔اتنی رات گئے کون ہوگا؟ابو نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔امی نے ڈرتے ڈرتے سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھا۔ابو کے چہرے پر خوف کی بجائے حیرت کے آثار نمایاں تھے۔خدا کرے سب ٹھیک ہو۔ان کی زبان سے نکلا۔

وہ دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھے۔

''پہلے پوچھ لیجیے کہ کون ہے؟''امی نے اونچی آواز میں کہا۔

''رحیل بھیا دروازہ کھولیے۔''گھبراہٹ میں ڈوبی ہوئی آواز کملا چاچی کی تھی۔

ابو نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

''کیا بات ہے بھابھی۔۔۔؟ اندر آئیے۔''

''آپ کے بھیا ابھی تک نہیں لوٹے۔'' وہ اندر آتی ہوئی بولیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''بات کیا ہے۔۔۔؟'' امی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''رات نو بجے کچھ لوگ آئے تھے۔'' انھوں نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ ''کسی میٹنگ ویٹنگ کی بات کر رہے تھے۔ آپ کے بھیا تھوڑی دیر میں واپس آنے کا کہہ کر گئے اور ابھی رات کے بارہ بج گئے ہیں۔۔۔ اب تک ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔'' کہتے کہتے وہ رو پڑیں۔

''ہمت رکھیے۔ وہ ضرور آ جائیں گے۔ پہلے مجھے بتائیے کہ وہ کون لوگ تھے جو انھیں بلانے آئے تھے؟'' ابو نے کہا۔

''اندھیرے میں چہرہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پائی۔''

''ان میں سے کسی کی آواز تو پہچانتی ہوں گی؟''

''نہیں۔۔۔'' چاچی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''لگتا ہے پاس کے گاؤں کے ہوں گے۔''

''اچھی بات ہے۔ آپ گھر جائیے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' ابو نے بستر کے نیچے سے ٹارچ نکالتے ہوئے کہا۔

''اس اندھیری رات میں آپ تنہا انھیں ڈھونڈنے کہاں جائیں گے۔ کسی اور کو ساتھ لے لیجیے۔'' امی نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

''اس وقت بھائیوں کو جگانا ٹھیک نہیں۔ سب گھبرا جائیں گے۔'' ابو نے کہا۔

''میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''تم اپنی امی کے ساتھ رہو اور ان کا خیال رکھنا۔۔۔'' انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

کسے پتہ تھا کہ آنے والے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔

ابو کے جانے کے بعد چاچی بھی چلی گئیں۔ امی نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور مجھے سو جانے کی ہدایت کی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں عجیب سی بے چینی دیکھی۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ انھیں نیند آئی نہ میں سو پایا۔

رات کے پچھلے پہر اچانک شور اٹھا۔

''اب کیا ہوا۔۔۔؟'' امی نے گھبرا کر بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

ان کی آواز سن کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں تیزی سے چھت پر گئے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

وہاں پہنچ کر ہمارے ہوش اڑ گئے۔ مکان کے پچھواڑے والے اناج گھر سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ چچا، بڑے ابو اور بہت سارے لوگ بجھانے میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی چیخ رہا تھا۔ کوئی بالٹی سے پانی پھینک رہا تھا۔ کوئی اونچی آواز میں گالیاں دے رہا تھا۔ ابو یا گھنشیام چاچا کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں نے نیچے جانے کی کوشش کی لیکن امی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
آگ بجھاتے بجھاتے صبح ہوگئی۔اناج گھر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگیا۔غنیمت ہوئی کہ ہمارا مکان محفوظ رہ گیا۔
ہم لوگ آنکھوں میں آنسو لیے سب کچھ دیکھتے رہے۔
ہمیں کیا خبر تھی کہ اس سے بڑا جھٹکا بھی لگنے والا ہے۔
صبح کے چھ بجے کسی نے آکر اطلاع دی۔
سب لوگ ندی کی طرف دوڑ پڑے۔امی نے اس بار بھی میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے مجھے باہر جانے سے روک دیا۔
اور اس کے بعد جو خبر آئی اس نے امی کو پتھر بنا دیا۔میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔
ندی کنارے ابو اور گھنشیام چاچا کی لاشیں پڑی تھیں۔
کئی ہفتے گزر گئے۔لیکن قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔
امی روتی رہیں۔میں اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ہمارے زخم ہرے رہے۔آخر میں بڑے ابو نے ہمیں کلکتہ جانے کا مشورہ دیا۔یہاں ہمارے کچھ رشتے دار تھے جنھوں نے ہماری ہر طرح سے مدد کی۔گاؤں سے ہمارے حصے کی پیداوار کی رقم آتی رہی اور تب بڑی مشکلوں سے زندگی کی گاڑی دوبارہ پٹری پر واپس آئی۔
آج بھی اپنے سر پر جب ابو کا دستِ شفقت محسوس کرتا ہوں تو ان کی ہدایت یاد آتی ہے۔''اپنی امی کے ساتھ رہو اور ان کا خیال رکھنا۔''!

چھبیس

ہفتوں سے شانتی کا فون نہیں آیا۔میری دفتری مصروفیتیں بھی بڑھی ہوئی تھیں ۔میں اس کے گھر جا سکا نہ اسے فون کر سکا۔ایک مرتبہ خواہش ہوئی لیکن یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ اس کے ساتھ دفتر کی مصروفیتیں نہیں ہیں ۔اسے مجھے فون کرنا چاہیے تھا- پھر خیال آیا۔کیا پتہ کہیں اس کے دشمنوں کی طبیعت ناساز نہ ہو یا مکھرجی بابو کہیں ـــــ مجھے ان لوگوں کی خبر معلوم کرنی چاہیے ۔وہ مجھے عزیز رکھتے ہیں ۔مجھ پر حد سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں ۔لہٰذا یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں ان سے ملاقات کروں......اس خیال کے آتے ہی میں نے طے کرلیا کہ دفتر سے چھٹی کے بعد سیدھے شانتی کے مکان جاؤں گا۔خدانخواستہ اس کی طبیعت خراب ہوئی تو عیادت کرلوں گا اور اگر سب کچھ حسبِ حال رہا تو شانتی کو لاپروائی کا قصور وار ٹھہرا کر کھری کھری سناؤں گا۔

دفتر کی خوبصورت دیوار پر آویزاں گھڑی سہ پہر کے چار بجا رہی تھی۔

چھٹی ہونے میں دیر تھی۔کچھ فائل ورکس بھی نپٹانے تھے۔

میں نے جلدی جلدی کام مکمل کیا۔فلاسک سے گلاس میں پانی ڈال کر ہونٹوں سے لگایا۔ابھی گلاس میز پر رکھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی ۔لائن پر شانتی تھی۔

''تجمل بول رہا ہوں ـــــ کیسی ہو؟ کئی دنوں سے تمہارا فون نہیں آیا-''

''تم نے بھی تو کوئی خبر نہیں لی ۔باپی مجھ سے زیادہ تم پر بھروسہ کرتے ہیں ۔اور تم نے ہماری خیریت تک جاننے کی کوشش نہیں کی۔'' شانتی کے لہجے میں غصے کی بجائے نقاہت نمایاں تھی۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟''میں نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

''ہاں ـــــ لیکن باپی ـــــ''

''کیا ہوا ـــــ انھیں؟''میں ایک دم گھبرا گیا۔

''ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے ۔پہلا اسٹروک تھا شاید اسی لیے بچ گئے۔''اس کی آواز کی نقاہت میں اضافہ ہو گیا۔

''تم فون رکھ دو ـــــ میں آرہا ہوں۔''

گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے والے تھے۔
میز سے بریف کیس اٹھایا اور دفتر سے نکل کر لفٹ کی طرف بڑھا۔
نیچے پہنچ کر عمارت سے باہر نکلا ہی تھا کہ ٹیکسی مل گئی۔
میں دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور شانتی کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ مکھر جی بابو کا مسکراتا ہوا چہرہ نظروں میں گھوم رہا تھا۔ اتنے کھلے دل اور صاف ستھرے ذہن کا آدمی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میری ذات پر ان کا بڑھتا ہوا اعتماد کبھی کبھی مجھے الجھن میں ڈال دیتا ہے۔
گاڑی ودیاساگر سیتو (دوسرا ہگلی پل) پر سے گزر رہی تھی۔ ہوڑہ پل پر ٹریفک جام کے سبب آج کل بیشتر گاڑیاں اس طرف رخ کرنے کی بجائے ودیاساگر سیتو سے گزرنے میں عافیت محسوس کرتی ہیں۔
جلد ہی گاڑی بنگال انجینئرنگ کالج کے بازو میں مکھر جی بابو کے تین منزلہ خوبصورت مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔
میں نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔
سورج ڈوب چکا تھا لیکن شام کی سیاہی پھیلنے میں دیر تھی۔ آس پاس کی دکانوں میں قمقمے روشن ہو چکے تھے۔
میں نے سڑک پار کی۔
عمارت کے گیٹ میں داخل ہو کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔
اوپر پہنچ کر دیکھا، شانتی دروازے پر کھڑی تھی۔
وہ مسکرائی لیکن چہرے کی چمک غائب تھی۔ اترا اترا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کافی تھکی ہوئی تھی۔
''دورہ کب پڑا ـــــ؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔
''صبح سات بجے ـــــ''
''اس وقت مجھے خبر کیوں نہیں دی۔؟''
''صبح سویرے تمھیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''
''تم جانتی ہو کہ انکل کو مجھ پر کتنا اعتماد ہے۔ میں تم لوگوں کے دکھ درد میں شریک نہیں ہو سکتا؟''
''ایسی کوئی بات نہیں ـــــ آؤ اندر چلتے ہیں۔'' کہتے ہوئے وہ مکھر جی بابو کے کمرے کی طرف مڑ گئی۔
میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔
''ہیلو سر! ـــــ'' ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے کہا۔
وہ بستر پر چت لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔
''نہیں اسی طرح لیٹے رہیے۔'' شانتی نے انھیں روکتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر انکل نے آپ کو اٹھنے سے منع کیا ہے۔''
''آؤ برخوردار ـــــ'' انھوں نے مجھے کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
شانتی ان کے بستر کے ایک کنارے بیٹھ گئی۔

''آج آپ بہت کمزور نظر آرہے ہیں۔''میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بالکل نہیں ـــــ شانتی بستر سے اترنے نہیں دیتی ہے ورنہ-''

''ٹھیک ہی تو کرتی ہے۔''

''میرا بہت خیال رکھتی ہے۔سوچتا ہوں کل یہ ٹوان ون اپنے گھر چلی گئی تو میرا کیا ہوگا ـــــ؟''انھوں نے حسبِ معمول مصنوعی سنجیدگی اپنے چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔

''ٹو اِن ون ـــــ؟''میں نے شانتی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''بیٹی کے ساتھ یہ میری ماں بھی ہے۔اسی لیے ہر بات پر کان کھینچتی ہے۔''

شانتی نے آنکھیں نکالیں۔

''بیٹی ـــــ''انھوں نے فوراً گفتگو کا رُخ موڑتے ہوئے کہا۔''لگتا ہے یہ بے چارہ دفتر سے سیدھے یہیں چلا آیا ہے۔اس کے لیے کچھ ناشتہ وغیرہ لاؤ۔''

''لاتی ہوں ـــــ''وہ اٹھ کر جانے لگی۔پھر مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''ہاتھ منہ دھولو ـــــ؟''

''نو تھینکس ـــــ''

''اچھی بات ہے۔باپی کے ساتھ بیٹھو۔مگر انھیں بستر سے اٹھنے نہ دینا۔میں چائے لے کر ابھی آئی ـــــ''

''دیکھا؟ ـــــ میں نے کہا تھا کہ بیٹی کے ساتھ یہ میری ماں بھی ہے ـــــ''مکھرجی بابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شانتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

''کیا بہت کمزوری محسوس ہو رہی ہے؟''میں نے ان کی طرف جھکتے ہوئے لگاوٹ سے کہا۔

''جوان بیٹی کا باپ کمزور ہو جائے تو سمجھو معاملہ ختم۔''انھوں نے کچھ عجب انداز سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔میں ایک مرتبہ پھر ان کی مضبوط قوتِ ارادی کا قائل ہو گیا۔

''اب ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ دنوں کے لیے کاروباری مصروفیتیں کم کر دیجیے۔''

''جانتے ہو،میرے اسٹاف میں ایک بھی تمھاری ذات والا نہیں ہے......''

''جس پر آپ بھروسہ کر سکیں۔''میں نے جملہ مکمل کر دیا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

''آپ کے شناساؤں میں کوئی نہیں ہے؟''میں نے ان کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

''ہے ـــــ لیکن وہ مسلمان ہونے کا فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔''ایک مرتبہ پھر ان کا قہقہہ گونجا۔

''کیا راجہ رام موہن رائے،ایشور چندر ودیا ساگر،نیتا جی سبھاش چندر بوس بھروسہ کے قابل نہیں تھے ـــــ؟''میں نے پوچھا۔

"آج کل ایسے لوگ کہاں ہیں ــــــ ؟" انھوں نے سرد آہ کھینچ کر کہا۔

"آپ کے خیال میں ایسا کیوں ہے؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں ــــــ سوچتا ہوں تو تکلیف ہوتی ہے۔"

"کیوں ــــــ ؟"

"بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"نہ سمجھو تو بہتر ہے ــــــ بلکہ آج کل یہ سب سوچنا بے کار ہے۔"

"کیوں ــــــ ؟" میں نے کریدتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ یہ سب باتیں جس قدر سوچو گے دماغ خراب ہوگا۔ تکلیف ہوگی ــــــ لو چائے آ گئی۔" انھوں نے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔

شانتی ٹرے میں چائے اور بسکٹ لے کر آ گئی۔

"نہیں ــــــ بتائیے۔ آپ کے خیال میں اس کا سبب کیا ہے؟" میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

شانتی نے موضوعِ گفتگو نہ سمجھ کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کچھ کہنے کی بجائے مکھرجی بابو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے چائے کا پیالہ اٹھانے کو کہا۔

میں نے حکم کی تعمیل کی۔

"دراصل بات یہ ہے کہ..." انھوں نے اپنا پیالہ لیتے ہوئے کہا۔ "لوگوں نے ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ تمھیں ایک چھوٹا سا واقعہ بتاؤں۔ پچھلے دنوں میری دکان کے بوڑھے کیشئر بابو کافی اداس نظر آ رہے تھے۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا۔ بہت معمولی سی بات تھی۔ توجہ سے سنو۔ صبح سویرے اپنی جیب سے ایک دس روپے کا نوٹ غائب ہونے پر انھوں نے اپنے آٹھ سالہ اکلوتے بیٹے سے پوچھ لیا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ان کا دل نہیں مانا۔ لہٰذا بیٹا جب غسل خانے میں گیا تو انھوں نے اس کی قمیص کی جیبیں ٹٹولیں۔ روپے نہیں ملے۔ شام کو دکان سے واپس ہوئے تو دفعتاً نوٹ کو بستر کے سرہانے گرا ہوا پایا۔ معصوم بیٹے کو بلا وجہ چور سمجھا۔ اس خیال سے ہی انھیں متلی آنے لگی۔"

مکھرجی بابو نے اپنی بات ختم کر کے خاموشی اختیار کر لی۔ نہ جانے کس خیال میں گم ہو گئے۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان کی چائے کچھ زیادہ تلخ ہو گئی ہے۔ میں انھیں دیر تک ایک ٹک دیکھتا رہا!

ستائیس

گاڑی تیزی سے میرے گھر کی طرف چل رہی تھی۔
اڑان پل پر چڑھتے ہی ہوا میں موجود خنکی اچھی لگی۔لیکن دھیرے دھیرے ہوا کے جھونکے ناقابلِ برداشت ہونے لگے۔
میں نے کھڑکی کے شیشے اوپر اٹھا دیے۔
گاڑی آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔پل پر نصب بجلی کے کھمبے پیچھے بھاگتے ہوئے نظر آرہے تھے۔
دفعتاً محسوس ہوا کہ کھمبوں کے ساتھ میرا ذہن بھی پیچھے کی طرف بھاگ رہا ہے۔
پچھلے ہفتے سمر نے دورانِ گفتگو مجھ سے کہا تھا۔
''تجیل ــــ وقت آگیا ہے۔جو فیصلہ کرنا ہے جلدی کر ڈال۔ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے میرے بھائی۔''
''ماں کو کیسے سمجھاؤں؟''میری زبان سے نکلا۔
''پہلے کوشش تو کر۔اور پھر ماں ہی کیوں۔تجھے تو اپنے پورے معاشرے کو اعتماد میں لینا ہوگا میرے بھائی۔''
''یہ اور بھی مشکل کام ہے۔''
''اچھی طرح سوچ لے۔یہاں تک آ کر پیچھے ہٹنا کیا تیرے لیے مناسب ہوگا میرے بھائی ــــ؟''
''لیکن اب تک مکھرجی بابو سے اس معاملے میں سنجیدگی سے گفتگو نہیں ہو پائی ہے۔''
''ہوگی کیسے ــــ؟ تجھے تو شانتی سے باتیں کرنے میں بھی ڈر لگتا ہے۔''
''صحیح ہے۔لیکن سوال ہے کہ آخر میں کیا کروں؟''
سمر نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔
''پہلے تو شانتی کو پروپوز کر میرے بھائی۔''
''وہ ناراض ہو گئی تو ــــ؟''
''تب انکل کو سب کچھ صاف صاف کہہ دینا۔کم از کم تیری پوزیشن تو صاف ہو جائے گی میرے بھائی۔''

''اور اگر وہ بھی برا مان گئے تو -؟''

''ایسی بات ہے تو سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے ۔میں باپ بیٹی سے باتیں کرلوں گا'' سمر نے پورے اعتماد سے کہا۔

''نہیں ـــــ'' اس مرتبہ مایا بیچ میں بول پڑی ۔''ایسے نازک معاملے میں کسی طرح کی جلد بازی مناسب نہیں ۔ایسا نہ ہو کہ تعلقات میں مضبوطی پیدا کرنے کی کوشش میں سارا معاملہ ہی بگڑ جائے ۔یوں بھی انکل کی طبیعت ان دنوں ٹھیک نہیں رہتی ۔شانتی بھی کچھ پریشان پریشان سی ہے ـــــ''

''میں سمجھتا ہوں کہ یہی مناسب وقت ہے جو کرنا ہے جلدی جلدی کرڈالو ـــــ کہیں دیر نہ ہو جائے ۔'' سمر نے مایا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مایا نے کچھ کہنے سے پہلے مجھ سے پوچھا۔

''تمھاری کیا رائے ہے ـــــ؟''

''میں ـــــ کیا کہوں؟'' مجھے شدید پریشانی لاحق ہونے لگی۔

''اِف یو وانٹ ٹو سے نو ـــــ نیور سے یس!'' مایا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اور اسی طرح اگر تو 'ہاں' کہنا چاہتا ہے تو 'نا' کے بارے میں سوچنا چھوڑ دے میرے بھائی -'' سمر نے میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

-

''جانتا ہوں باپ بیٹی دونوں مجھے چاہتے ہیں -اپنے گھر کے ایک فرد کی طرح سمجھتے ہیں لیکن......''

''کیا تم شانتی کو نہیں چاہتے ـــــ؟'' مایا نے کہا۔

''چاہتا ہوں ـــــ لیکن کبھی اس موضوع پر سنجیدگی سے اس سے گفتگو نہیں ہو پائی ہے ۔''

''اچھی بات ہے ۔'' مایا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ۔''ہماری پکنک کب ہو رہی ہے؟''

''آئندہ مہینے ـــــ'' سمر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے ۔اسی دن فیصلہ ہو جائے گا۔''

''کیا فیصلہ ـــــ؟'' میں نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

''اس دن کسی اچھے موڈ میں شانتی سے اس کے دل کی بات اگلوا لوں گی ۔''

''تب تو پکنک کا سارا خرچ شجیل کے ذمے ہونا چاہیے ۔'' سمر نے مسکرا کر مایا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل نہیں ـــــ'' مایا نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں نہیں ـــــ؟''

''شجیل سے ہم لوگ پارٹی لیں گے ۔'' وہ مسکرائی ۔

''کیوں میرے بھائی ـــــ تیار ہو؟''

''میں تو راضی ہوں اسی میں جو رضا تیری ہے ۔''

''یس ـــــ دیٹس لائک اے گڈ بوائے۔''

میں نے اپنی رضامندی دے ڈالی لیکن اندر سے ایک خوف مجھے دبوچ رہا تھا۔ادھر سے انکار کی صورت میں کیا ہوگا-؟اور اگر ان لوگوں کی مرضی حق میں ہوئی تو میں اپنی ماں کو کیسے راضی کروں گا-؟ اپنے رشتہ داروں کو کیا سمجھاؤں گا؟ ذہن میں عجیب رسہ کشی چل رہی تھی ۔ایک طرف باپ بیٹی کا مجھ پر بڑھتا ہوا اعتماد تھا دوسری طرف میرا معاشرہ ـــــ مجھے اپنا وجود ان کے آگے لمحہ لمحہ چھوٹا ہوتا نظر آرہا تھا۔

غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ پیشانی تک پہنچ گیا۔پسینے کی بوندیں نمودار ہو چکی تھیں ۔جیب سے رومال نکال کر انھیں خشک کیا۔گاڑی اڑان پل سے نیچے اتر کر جی ۔ٹی ۔روڈ پر دوڑ رہی تھی ۔میں نے کھڑکی کے شیشے نیچے گرا دیے۔

دفعتاً ہوا کے جھونکوں سے راحت ملی۔

میں نے محسوس کیا۔دل کے کسی گوشے سے آواز آرہی تھی ۔

''باپ بیٹی کے اعتماد کے سامنے میرے وجود کو چھوٹا نہیں ہونا چاہیے۔''

''صاحب ۔کہاں اترنا ہے؟''ڈرائیور کی آواز نے چونکا دیا۔

''بس بس ۔یہیں روک دو۔''میں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

کرایہ ادا کر کے گاڑی سے اترا اور سگریٹ خریدنے کی نیت سے پھوٹک کی دکان کی طرف بڑھ گیا۔

آسمان پر بادل گھر آئے تھے ۔کسی بھی وقت بارش ہو سکتی تھی ۔

اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں ۔سڑک کی دھول آنکھوں میں چبھنے لگی ۔بعض دکانوں کے سامنے لگے ہوئے ٹن کے شیڈ پھڑ پھڑانے لگے ۔دھول بھری آندھی چلنے کے سبب لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے ۔

پھوٹک نے مجھے دور سے دیکھ لیا۔جلدی سے میرا برانڈ اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

''بابو ـــــ پیسے کل دے دیجیے گا۔جلدی گھر چلے جائیے ۔زوردار بارش ہونے والی ہے۔''

میں نے مسکرا کر پیکٹ لے لیا اور تیزی سے گھر کی طرف چل پڑا!

اٹھائیس

ہوٹل کا کمرہ بہت آرام دہ تھا۔کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیے تھے۔اسی لیے موسم کی ٹھنڈک کا احساس کم ہو رہا تھا۔لیکن نیند نے نہ آنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

میں نے بستر سے اٹھ کر گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔پانی پیا اور دیوار گھڑی کی طرف دیکھا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

نہ جانے کیوں یکے بعد دیگرے سبھی یاد آرہے تھے۔مایا،سمر،شانتی،مکھرجی بابو......

دفعتاً ان لوگوں کے درمیان ماں کا چہرہ نظر آیا۔

سر کے بال نصف سے زائد سفید۔چہرے پر جھریوں کی آمد کا اعلان۔جسم پر سفید ساڑی اور ڈھلتی عمر میں آنے والی بیماریوں میں بھی مطمئن

وہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے جارہی تھی۔میں نے آہستہ سے آواز دی۔

مڑ کر مجھے دیکھا۔

''ماں ـــــ تم سے مجھے کچھ کہنا ہے۔''

''ابھی سو جا۔صبح بتا دینا۔میری پیٹھ میں درد ہے۔کھڑے ہونے میں تکلیف ہو رہی ہے۔''

''تو میرے پاس بیٹھو۔میں مرہم لگا دیتا ہوں۔''

''ماں پر بڑا پیار آرہا ہے۔''اس نے رک کر کہا۔

''پہلے ادھر آ کر بیٹھو۔پھر بتاتا ہوں۔''

وہ نہ چاہتے ہوئے میرے بستر کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''اب بتا ـــــ کیا بات ہے؟''

''شادی کرنا چاہتا ہوں ـــــ''میں نے گولہ داغ دیا۔

''ارے واہ ـــــ بڑی اچھی بات ہے۔کم از کم تجھے میری حالت پر رحم تو آیا۔''ماں نے مسکرا کر کہا۔

میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

''کل سے تیرے لیے لڑکی دیکھنا شروع کرتی ہوں۔''

''ماں ـــــ شانتی ہے نا۔''میں نے جلدی سے کہا۔

''شانتی ـــــ؟ لیکن وہ تو......''ماں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

''ماں۔تجھے وہ پسند ہے۔''

''لیکن وہ ہندو ـــــ ہم مسلمان۔اپنے رشتہ داروں سے کیا کہیں گے۔ہمارا معاشرہ ان سے الگ ہے۔ہماری تہذیب' مذہب' زبان' نام-سب کچھ ان سے الگ ہے۔ایسے عالم میں یہ شادی کیسے ہو سکتی ہے۔''ماں حیران تھی۔

''شانتی بہت اچھی لڑکی ہے اور اس کے والد بھی مجھے بے حد چاہتے ہیں۔''

''لیکن بیٹے۔سمجھنے کی کوشش کر۔ایک لڑکی کے لیے ہم اپنے پورے سماج سے کیسے الگ ہو سکتے ہیں۔مانتی ہوں کہ شانتی اچھی لڑکی ہے۔اس سے دوستی بھی ٹھیک ہے لیکن اس کے پیار میں اندھا ہو کر تو اپنے سماج سے بغاوت کرے گا؟''

''ماں ـــــ بات وہ نہیں ہے۔اس کے پیار میں میرے اندھے ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔میں صرف ان لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تو ان سے ازدواجی رشتہ جوڑ لے۔''

''ماں' بات صرف رشتہ جوڑنے کی بھی نہیں ہے۔''

''تو کیا بات ہے ـــــ اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

''دراصل معاملہ ان لوگوں کے معیار پر پورا اترنے کا ہے۔''

''کیا مطلب؟''ماں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ کہ باپ بیٹی دونوں مجھے بہت عزیز رکھتے ہیں ـــــ اور سب سے نازک معاملہ یہ ہے وہ مجھے ایک آئیڈیل مسلم نوجوان سمجھ کر مجھ پر بے حد اعتماد کرتے ہیں۔''

''تو اس اعتماد پر پورا اترنے کے لیے شادی ضروری ہے؟''

''شاید ہاں ـــــ!''

''ٹھنڈے دل سے سوچ کر فیصلہ کرنا۔ایسا نہ ہو کہ بعد میں تجھے پچھتانا پڑے ـــــ اور مجھے بھی۔''

''ایسا نہیں ہو گا ماں۔''

''مجھے تیری باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔''

''ماں ـــــ میرے ذریعہ اگر انہیں کسی طرح کی ٹھیس پہنچی تو ان کی نظروں میں ہماری پوری قوم بدنام ہو جائے گی۔کیا تم چاہتی ہو کہ ایسا ہو؟''

ماں مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی اور میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کی حیرت میں میرے لیے نفرت کا عکس ہے یا تعریف کا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد ماں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں ہونقوں کی طرح کھڑکی سے باہر پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھ رہا تھا۔

سارا شہر نیند کی آغوش میں تھا اور چاند خاموشی سے اپنی چاندنی لٹانے میں مصروف تھا ـــــ چاندنی! ایک ایسی نرم روشنی جس میں اجالا بھی تھا اور ٹھنڈک بھی!

دفعتاً مجھے کسی آواز نے چونکا دیا۔

دیکھا۔

بستر کے کنارے رکھا ہوا ٹیلی فون بج رہا تھا۔

میں نے نہ چاہتے ہوئے چادر کو جسم سے الگ کیا اور ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو ـــــ!“

”کیوں سو گئے ـــــ؟ ہماری ممبئی آدھی رات کے بعد جوان ہوتی ہے۔“

”کون ـــــ؟“ میں نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں رگھو بول رہا ہوں بھائی ـــــ کیا فیصلہ کیا ـــــ؟“

میں نے ایک لمحہ کے لیے کچھ سوچا پھر رانگ نمبر کہہ کر ماؤتھ پیس کو کریڈل پر رکھ دیا!!

ختم شد

”یہ صفحہ!

بہت ہی پیارے دوست

جناب صلاح الدین احمد
(غازی پور)

کے لیے!“

اردو دوست ڈاٹ کوم

اردو دوست لائبریری

www.UrduDost.com/library

یہ کتاب اپنے کسی دوست یا
رشتے دار کو ای میل کیجئے